فہرست

مضمون نگاران معارف

جلد ۱۴۴

ماہ جولائی ۱۹۸۹ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۴۴

ماہ جولائی ۱۹۸۹ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۹ء

(بترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۴۴ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ جولائی ۸۹ء عدد ۱

مضامین

Accession No. 30757
Class No. معارف
Book No. 110

معارف کے پاکستانی خریدار اپنا سالانہ چندہ ۷۵ روپے اس پتہ پر ارسال کریں:۔
حافظ محمد یحییٰ، پہلی منزل، شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔ پاکستان

شذرات

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے صد سالہ جشن ولادت کی تقریبات منانے کے لئے جو پروگرام طے کئے تھے وہ گزشتہ ماہ دہلی اور لکھنؤ میں بخیر و خوبی انجام پائے، مولانا جنگِ آزادی کے میر کارواں اور ہندوستان کے معمارِ اعظم تھے لیکن ان کی عملی زندگی کا آغاز اردو صحافت سے ہوا تھا، الہلال والبلاغ کی نظیر آج تک اردو صحافت پیش نہیں کر سکی ہے مگر امتداد زمانہ سے ان کی جلدیں نایاب ہو رہی تھیں اس لئے اکادمی نے مولانا آزاد صدی تقریبات کا آغاز الہلال کی جلدوں کی اشاعت سے کیا جس کا اجرا ۲۰ جون کو دہلی میں نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے کیا۔ اکادمی نے مولانا کی بعض تصنیفات اور طویل کتابوں کے انتخاب بھی شائع کئے تھے، الہلال کے ساتھ اُن کا اجرا بھی ہوا، اس موقع پر اردو کے مشہور محقق اور ابوالکلامیات کے ماہر جناب مالک رام صاحب کو اکادمی کی جانب سے مولانا آزاد خصوصی انعام تفویض کیا گیا جس کے وہ اپنی گوناگوں علمی و تحقیقی خدمات اور آزاد شناسی کی بنا پر بجا طور سے مستحق تھے، ہم ان کو مبارکباد پیش کرنے کے ساتھ ہی اکادمی کو اس قدر شناسی کی داد بھی دیتے ہیں، اب یہ انعام ہر سال کسی اسکالر کو پیش کیا جائے گا۔

الہلال کی تمام جلدوں کی ہندوستان میں از سر نو اشاعت اکادمی کے چیرمین ڈاکٹر محمود الٰہی اور سکریٹری جناب رام کرشن درما کی کوششوں کی مرہون منت ہے ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ اس کے لئے وہ اہل علم اور مولانا کے ادب و انشا کے قدر دانوں کے شکریے کے مستحق ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمود الٰہی کی محنت شاقہ کا اندازہ راقم کے نام ان کے ایک گرامی نامہ کی ان سطور سے کیا جاسکتا ہے "آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ اکادمی "الہلال" کی ساتوں جلدوں کا عکس شائع کر رہی ہے، مہینوں سے اس کی ترتیب میں لگا ہوا ہوں، کہاں کہاں سے جلدیں فراہم ہوئیں، اور ان کا عکس

لیا گیا۔ یہ ایک بڑی دلچسپ مگر طویل داستان ہے۔"

اکادمی کا دوسرا منصوبہ مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک آل انڈیا سہ روزہ سمینار تھا جو ہوٹل کلارکس اودھ ہال لکھنؤ میں ۲۲ تا ۲۴ جون کو ہوا۔ اس کا افتتاح مرکزی وزیر ماحولیات جناب ضیاء الرحمن انصاری نے کیا، ان کو مولانا سے جو والہانہ عقیدت ہے اس کا اظہار ان کی تقریر کے لفظ لفظ سے ہو رہا تھا، افتتاحی اجلاس کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے کی، انہوں نے مولانا کی فہم و فراست اور سیاسی تدبر پر زور دیتے ہوئے انڈیا ونس فریڈم کے حوالہ سے بتایا کہ ملک کی تقسیم کے ذمہ دار خود کانگریسی رہنما بھی تھے، سید حامد صاحب نے "اقتدار کا انتقال" کے عنوان سے جو مقالہ پڑھا تھا اس میں اس مسئلہ کا زیادہ تفصیل سے ذکر تھا، انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ انڈیا ونس فریڈم مولانا آزاد کی تصنیف ہے، سید حامد صاحب کی شخصیت جس قدر دلکش اور پاکیزہ ہے اس سے زیادہ ان کی تقریر خوبصورت اور دل آویز ہوتی ہے۔ جناب شبیہ الحسن صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے زورِ خطابت اور خوش نوائی نے بھی حاضرین کو بہت محظوظ کیا، مولانا کی انشا میں خطابت کی گھن گرج کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اعتراف کیا کہ مولانا شبلی ان سے بڑے انشا پرداز تھے، ان کی یہ بات بھی پسند کی گئی کہ "مولانا برصغیر میں فارسی انشا پردازی کی روایت کے آخری امین تھے"، اکادمی کی صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ اور چیرمین ڈاکٹر محمود الٰہی نے مہمانوں کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور سمینار کے اغراض و مقاصد بتائے۔ وائس چیرمین ڈاکٹر امیر اللہ شاہین نے شکریہ ادا کیا۔

سمینار کے باقی ۵ جلسے مقالات خوانی کے لئے مخصوص رہے مگر مقالہ نگاروں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بعض حضرات خود ہی اپنے حق سے دستبردار ہو گئے اور آخری تین اجلاس کے مقالہ نگاروں کو اپنے مقالوں کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کرنا پڑا، تاہم منتظمین نے کارروائی اس

خوش اسلوبی سے چلائی کہ کسی کو شکوہ شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور اکثر لوگوں نے اپنے مقالے بھی
پڑھ لیے، البتہ وقت کی کمی کے سبب سے مقالوں پر بحث و گفتگو کا سلسلہ شروع ہی سے موقوف رہا۔
راقم نے بھی اس کا لحاظ کر کے اپنے مقالہ "قرآن مجید کا تصور ربوبیت اور مولانا آزاد" کا پہلا صفحہ
پڑھ کر یہ عرض کر کے بیٹھ جانا چاہا کہ آگے کے مباحث ایک دوسرے سے اس قدر پیوستہ ہیں
کہ ان کو نہ پڑھنا ہی بہتر ہوگا تو جناب شبیہ الحسن نے فرمایا کہ اس کریڈٹ کے مستحق مولانا کے بجائے
شیخ محمد عبدہ مصری ہیں، میری نظر سے محمد عبدہ کی تفسیر سورہ فاتحہ بہت پہلے گزری تھی مگر اس
وقت وہ دستیاب نہ ہو سکی تاہم مجھے اطمینان ہے کہ مولانا کے خیالات محمد عبدہ کی صدائے بازگشت نہیں ہیں۔

سیمنار کی کامیابی کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اس میں ہر علاقہ کے دانشور اور مختلف یونیورسٹیوں
کے اساتذہ اردو شریک ہوئے۔ اور انہوں نے مولانا کی شخصیت اور کمالات پر دلچسپ انداز
اور نئے زاویوں سے بحث کی۔ بعض مقالوں میں دوسرے رخ کا ذکر بھی تھا۔ پروفیسر تنویر احمد علوی
نے مولانا کی کتاب "تذکرہ" کے بارہ میں کچھ باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ مولانا نے نہ تو
اپنے سوانح لکھے اور نہ اپنے خاندانی بزرگوں کے، انہوں نے فضل الدین احمد صاحب کے مقدمہ کو خود
مولانا کا ہی لکھا ہوا بتایا، ان کے سوالات چونکا دینے والے تھے مگر ڈاکٹر محمود الٰہی نے اس کا جواب
دے کر حاضرین کے استعجاب کو دور کر دیا۔ جناب عشرت علی اور عابد سہیل کے مقالوں میں
انڈیا ونس فریڈم کے بعض مندرجات زیر بحث آئے تھے، ان کے خیال میں مولانا سے حالات
کا اندازہ کرنے میں غلطی ہوئی۔ ملک کی تقسیم اب رک نہیں سکتی تھی، جواہر لال کو اس کا ذمہ دار
بتانا صحیح نہیں، جناب رشید حسن خاں نے مولانا کی انشا پردازی پر بحث کرتے ہوئے ان
کی تحریروں میں اشعار کی کثرت کو تکلف و آورد بتایا۔ یہ سب مقالے جلد ہی اکادمی سے
کتابی صورت میں چھپنے والے ہیں۔

مقالات

ہندوستان میں علوم قرآنی کا نشو ونما
اور
اسلامی معاشرہ پر اس کا اثر

از

پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ

(۲)

تجوید و قرأت اسلامی ہند کے بالکل ابتدائی دور ہی سے قرأت کے ساتوں طریقے یہاں
رائج ہو گئے تھے، شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے ایک چھوٹے سے مقام کوٹ اروڑ میں ۷
طرز کی قرأت سیکھی تھی، ضیاء الدین برنی نے اس فن کے بعض ماہرین کا ذکر کیا ہے، اور لکھا
ہے کہ مولانا جمال الدین شاطبیؒ، علاء الدین مقریؒ اور خواجہ زکی اس پایہ کے قاری تھے کہ

"مثل ایشاں در خراسان و عراق نشان نمادہ اند" (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۵)

عجیب بات ہے کہ تجوید اور قرأت سے اس تمام دلچسپی کے باوجود ابتدائی زمانہ میں
کوئی کتاب اس فن پر ہندوستان میں نہیں لکھی گئی، اس فن کے قواعد جس طرح مرتب ہو گئے
تھے، ان ہی خطوط پر تعلیم دی جاتی رہی، اور کسی مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی،
اس فن پر باقاعدہ کتابیں تصنیف کرنے کی ضرورت اکبر کے عہد میں پیش آئی، اور اس
وقت سے تجوید پر مسلسل کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں، اس کا پس منظر قابل غور ہے، اکبر کے

زمانے میں عربی پڑھنے والوں پر عتاب شاہی تھا، ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے

"عربی خواندن و دانستن آں عیب شد، و فقہ و تفسیر و حدیث و خوانندۂ آں مطعون و مردود" (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۲۰)

پھر عربی حروف کو عام زبان سے نکالنے کی کوشش کی گئی، لکھا ہے:

"حروف خاصۂ زبان عرب مثلاً ثا، حا، عین، صاد، ضاد، طاد ظا از تلفظ برطرف ساختند" (ص ۳۰۷)	ایسے حروف جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً ث، ح، ع ص، ض، ط، ظ کو بول چال سے نکال دیا گیا۔

اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ

"عبداللہ را ابداللہ و احدی را اہدی و امثال آں دگری گفتند، خوش می داشتند" (ص ۳۰۷)	عبداللہ کو ابداللہ، احدی کو اہدی اور ازیں قبیل الفاظ کو بگاڑ کر کوئی بولتا تو بادشاہ خوش ہوتے تھے۔

تجوید کے لیے یہ صورت انتہائی تشویشناک تھی، اگر اس وقت اس کے اصول صاف طور پر نہ لکھے جاتے تو یہ لسانی تجربات قرآنی تعلیم کے پورے نظام کو مجروح کر دیتے، اور صورت وہی پیش آجاتی جو محمد علی باب کے زمانے میں پیش آئی کہ قرآن کے اعراب کو غلط پڑھتا تھا، جب علماء نے اعتراض کیا تو بولا:

اب میری امامت کے تصدق میں ہیں آزاد ٭ محبوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات

اکبری دور کی صورت حال کا رد عمل سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے یہاں ظاہر ہوا، انھوں نے "الدر الفرید فی القراءۃ والتجوید" لکھی اور اس صورتِ حال کا

مقابلہ اس طرح کیا کہ پھر اس نوع کی کسی کوشش کی ہمت نہ ہوئی، ان کے بعد شیخ محمد صدیقی کاکوروی (م ۱۰۰۲ھ / ۱۵۹۳ء) نے "شرح الشاطبیۃ" اور شیخ نور الدین محمد نے "مقصود القاری" تصنیف کی، آیندہ صدیوں میں تجوید پر خاص زور دیا گیا، اور قراءت کے بہت سے اعلیٰ مرکز وجود میں آگئے، یہ دوسری کوشش اس وقت شروع ہوئی جب انگریزی اقتدار ملک میں قائم ہوا، اور مذہبی علوم پر مختلف انداز میں حملے شروع ہو گئے، اس زمانے میں مولوی کرامت علی جون پوری (م ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء) کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، انھوں نے زینۃ القاری اور شرح الجزریہ اردو میں لکھیں، پھر قاری عبدالرحمن پانی پتی (م ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء) نے التحفۃ النذریہ فارسی میں لکھی، اور پانی پت میں قراءت و تجوید کا بہت بڑا مرکز قائم کیا، انھوں نے یہ فن امروہہ کے قاری امام الدین سے سیکھا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امروہہ بھی اس زمانے میں فن تجوید کا مرکز بن گیا تھا۔

تفسیر "تاج المآثر" کے مصنف نے جو قطب الدین ایبک کا معاصر ہے، لاہور کے متعلق لکھا ہے:

از ہر صدتن، نود ورد عالم از ہر دہ، نہ مفسر قرآن
(قلمی نسخہ)

یہ بیان مبالغہ آمیز ہو سکتا ہے، لیکن اس سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اسلامی ہند کے ابتدائی زمانے میں علم تفسیر سے دلچسپی کس حد کو پہونچ گئی تھی، تفسیر میں شغف کی نوعیت دو طرح کی تھی:

(۱) متداول تفاسیر کے شروح و حواشی تیار کرنے میں انہماک۔

(۲) قرآن کو عصری رجحانات کی روشنی میں سمجھنے اور پیش کرنے کا جذبہ۔

اسلامی ہند کے ابتدائی دور میں رجحان اس طرف تھا کہ علم کے تمام شعبوں میں اجتہاد کے بجائے تقلید سے کام لیا جائے، اور جو علمی سرمایہ منگولوں کی دست برد سے بچ گیا ہے اس کی پوری پوری حفاظت کی جائے، اور ساری کاوشیں ان ہی دائروں میں محدود رکھی جائیں، اس زمانہ میں جو علماء اسلامی ممالک سے یہاں آئے تھے، انھوں نے ایسے ہوش رُبا دور میں اپنے وطن چھوڑے تھے کہ تحقیقی کاموں کی طرف ذہن کا متوجہ ہونا دشوار تھا، جو کچھ وہ بچا لائے تھے اس کو سینے سے لگائے اس کی حفاظت میں مصروف رہنے ہی میں عافیت سمجھتے تھے، کچھ عرصہ بعد جب سلطنت دہلی نے استحکام حاصل کر لیا اور مسلمانوں کے تہذیبی اور تمدنی اداروں کی مضبوط داغ بیل پڑ گئی، تو صورت حال میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

قرآن پاک کی جو تفاسیر اس زمانے میں مطالعہ میں رہیں وہ مدارک، بیضاوی، کشاف، تفسیر مقاتل، تفسیر حقائق، تفسیر ناصری، تفسیر زاہدی اور جلالین تھیں، ایک مدت تک علماء کی تفسیری کاوشیں ان تفاسیر ہی کے گرد گھومتی رہیں، اور سارا زور ان ہی کی شرحیں اور حواشی تیار کرنے پر رہا۔

تفسیر "مدارک التنزیل" اور "تفسیر مقاتل" (مقاتل بن سلیمان عن ابن عباس، مفتاح السعادۃ ص ۴۰۳) کا ناگور کے علمی حلقوں میں بڑا چرچا تھا (سرور الصدور قلمی ۴۴-۴۱-۲۹) تفسیر مقاتل کے متعلق شیخ حمید الدین ناگوریؒ فرمایا کرتے تھے:

"نیک تفسیرے پاکیزہ است و مثل ندارد، و شافعی آں را ستودہ ست" (ص ۲۹)

"تفسیر زاہدی" کو شیخ سعد الدین بندال نے رائج کیا تھا، اور یہ اوچھ سے لے کر منیر تک مقبول تھی، سبب یہ تھا کہ اس میں مذکرین کی پسند کا بہت مواد تھا۔

کشاف کے متعلق ہندوستان کے علمی حلقوں کی رائے میں بڑا اختلاف تھا، اس میں شک نہیں کہ "کشاف" میں علم کلام کے مسائل کو بڑی خوبی سے حل کیا گیا ہے، اور اسی بنا پر ابن خلدون نے اس کو علم کلام کی بنیاد قرار دیا ہے، لیکن اس کے طرز استدلال میں کچھ خطرات بھی پوشیدہ تھے، چنانچہ ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس انداز فکر کے شدید مخالف تھے، انھوں نے اپنے بیٹے شیخ صدر الدینؒ کو زمخشری کی نحو مفصل تک پڑھنے سے روک دیا تھا، لیکن شیخ حمید الدین ناگوریؒ اس کے بے حد قائل تھے، اور اکثر زیر مطالعہ رکھتے تھے، اور مطالعہ کی سہولت کے پیش نظر چھوٹی تقطیع پر لکھوا لیا تھا، ان کا خیال تھا کہ تفسیر کی تمام کتابیں اسی سے ماخوذ ہیں، کہتے تھے:

"آنچہ در کتابہائے دیگر ست ہم ازیں کتاب ست، ہر چہ دانستہ اند و خوش آمدہ است ازیں جا نقل کردہ اند و کتابے علیحدہ بنام خویش کردہ اند"

(سرور الصدور قلمی ص ۴۴)

شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے یہاں بھی "کشاف" کا کافی چرچا تھا، ان کے ایک مرید مولانا رکن الدین چغرؒ نے "کشاف" اور "مفصل" نہایت خوشخط لکھ کر شیخ کو پیش کی تھیں، لیکن ان کے مطالعہ میں "تفسیر ناصری" زیادہ رہتی تھی۔

امام فخر الدین رازیؒ کی "تفسیر کبیر" کے متعلق ہندوستان میں ہمیشہ ایک رائے رہی، شیخ حمید الدین ناگوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا شمس الدین حلوائیؒ اس کے مطالعہ سے منع کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ امام رازی نے

"حجت خصم را محکم بیان کردہ است و جواب از طرف خود سست گفتہ"

تقریباً ۶۰۰ سال بعد یہی رائے مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی ظاہر کی، ترجمان القرآن میں

لکھتے ہیں:

"شکوک و ایرادات کے بے شمار دروازے کھل گئے، ان کے کھولنے میں تو امام رازی کا ہاتھ بہت تیز نکلا، لیکن بند کرنے میں تیزی نہ دکھا سکے" (ج ۱ ص ۱۳)

اقبال نے بھی ان کی فکر کی گہرائی کو تو تسلیم کیا ہے، لیکن ان کی رہبری کو قبول نہیں کیا:

ز رازی حکمتِ قرآں بیاموز
چراغے از چراغِ او بر افروز
ولے این نکتہ را از من فراگیر
کہ نتواں زیستن بے مستی و سوز

تفسیر کی ان کتابوں پر بعض حواشی بھی اس زمانہ میں لکھے گئے، سید محمد بن یوسف حسینی (گلبرگہ) نے پانچ جلدوں میں "کشاف" کی شرح لکھی، شیخ جمال الدین (گجرات) نے "مدارک التنزیل" پر حواشی مرتب کیے، جلالین پر حواشی کی نوبت اس وقت آئی جب شاہ ولی اللہؒ نے اپنے نصاب میں اس کو خاص مقام دے دیا، سب سے زیادہ توجہ عبد اللہ ابن عمر البیضاوی (م ۱۳۱۹ء) کی تفسیر "انوار التنزیل و اسرار التاویل" پر کی گئی، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ تفسیر اس وقت لکھی گئی تھی جب منگولوں کا طوفان اپنی قوت ختم کر چکا تھا، اسلامی معاشرہ پر موجِ خون گذر چکی تھی، اب عقائد کو

معارف ۸۵

ایک محکم صورت دینے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی، بیضاوی نے عقائد کی تہذیب اور تعیین کا کام بڑی قابلیت سے انجام دیا ہے، چنانچہ ہندوستان میں بھی بیضاوی کی مقبولیت کا یہی راز تھا، بعد کو بیضاوی پر عبد الحکیم سیالکوٹی (م ۱۰۶۷ھ) شیخ وجیہ الدین علوی (م ۹۹۸ھ)، قاضی نور اللہ شستری، مولانا عبد السلام لاہوری نے حاشیے لکھے۔

Accession No. 30757
Class No. معارف
Book No. 110

محمد بن تغلق کے زمانے میں امام ابن تیمیہؒ کے اثرات ہندوستان پہونچے، اور ان کے ایک شاگرد مولانا عبد العزیز اردبیلی نے محمد بن تغلق کی فکر کو متاثر کیا، یہ اسی کا اثر تھا کہ دہلی کے بازاروں میں لوگ نماز روزے کے مسائل یاد کرتے نظر آنے لگے۔

ہندوستان کی تفاسیر اور ترجمے

ہندوستان میں قرآن پاک کی تفسیر اور ترجموں کے سلسلہ میں مختلف زبانوں میں جو کوششیں کی گئی ہیں، ان سے مسلم معاشرہ کے رجحانات، فکری تبدیلیوں، سماج کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

ابتدائی دور کی دو تفسیریں خاص طور پر قابل توجہ ہیں، ایک مولانا قاسم کی "لطائف التفسیر" اور دوسری تفسیر تاتارخانیہ، پہلی کا مقصد خاص و عام کو فائدہ پہونچانا تھا، دوسری کا علماء کے لیے سہولت فراہم کرنا، "لطائف التفسیر"

25392

کے مصنف شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے خواہر زادہ تھے، بارہ برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا، مولانا جلال الدین سے کشاف کا درس لیا تھا، اپنی تفسیر کے دیباچہ میں مقصد تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں:

"...... میں نے عربی
اور فارسی کی تفسیروں کا مطالعہ
کیا، اور ہر ایک تفسیر کی عبارت
لطیف اور الفاظ و معنی عجیب
و غریب اور ہر ایک کو خاص
رنگ میں پایا، میں نے خیال کیا
کہ ایک ایسی تفسیر لکھی جائے
جو ان تمام معانی و غرائب اور
تمام تفسیروں کے لطائف پر
مشتمل ہو، تاکہ خاص و عام
کو اس کے مطالعہ سے فائدہ پہونچے
اور اس کے مطالعہ سے لوگ
قرآن کے اسرار اور دقائق سے
واقف ہو سکیں"۔

(سیر الاولیاء)

یہ کتاب اب دستیاب نہیں، میر خورد صاحب سیر الاولیاء نے اس کا مقدمہ بڑے احترام سے نقل کیا ہے۔ مقصد تصنیف کے دو پہلو قابل غور ہیں۔ ایک خاص و عام کا فائدہ، دوسرے اسرار قرآن سے متعارف کرنے کا جذبہ۔

"تفسیر تاتارخانیہ" غالباً ہندوستان میں تفسیر کی سب سے بڑی کوشش تھی۔ تاتارخاں کو علوم اسلامی سے گہری دلچسپی تھی۔ فقہ کی مشہور کتاب "فتاوائے تاتارخانیہ" عالم بن علاء نے اسی بنا پر اس کے نام معنون کی تھی۔ تفسیر تاتارخانیہ بالکل اس انداز سے لکھی گئی تھی جیسے اورنگ زیب کے عہد میں "فتاوائے عالمگیری" کی تدوین عمل میں آئی تھی۔ علماء کا ایک بورڈ اس کی تیاری میں شریک تھا اور تفسیر کا سارا ذخیرہ جو اس وقت دستیاب تھا، مصنفین کے پیش نظر تھا۔ شمس سراج عفیف کا بیان ہے:۔

"تمام تفاسیر راجمع کنانیدہ، جماعہ علماء را حاضر گردانیدہ، در ہر آیتے وکلمہ آں قدر مفسران گزشتہ کہ اختلاف نوشتہ بودند، تاتارخاں آں جمیع اختلاف در تفسیر خویش نوشتہ بود و برائے تالیف تفسیر بدل وجان نخست و در ہر یک اختلاف حوالہ بداں صاحب تفسیر کردہ، گوئی جملہ تفاسیر در یک تفسیر جمع گردانیدہ"

(تاریخ فیروز شاہی، ۳۹۰-۳۹۱)

افسوس ہے کہ اس تفسیر کا بھی کوئی نسخہ اب دستیاب نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ تفسیر تاتارخانیہ اور فتاوائے تاتارخانیہ کے ذریعہ اس مرض کا علاج کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس کا اجمالی نقشہ خود فیروز خاں نے فتوحات میں پیش کیا ہے۔ بقول فیروز شاہ ایک فرقہ ایسا بھی تھا کہ ع

"قرآن مجید را ملحقات عثمانی می خوانند" (فتوحات فیروز شاہی ص ۷)

ملحدان و اباحتیان ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ شرک و بدعات کا دور دورہ تھا۔ احمد بہاری

کے مریدین کہتے تھے۔

در دہلی خدا طالع شدہ است" (ص۸۰)

ایک شخص رکن نے جو مہدی ہونے کا دعوی دار تھا، اپنے خیالات کی اشاعت میں کتابیں نشر کی تھیں، بقول فیروز شاہ "بدعت وضلالت" پھیلی ہوئی تھی۔ بت پرستی، توہم پرستی، شرک و بدعات کے اس دور میں تفسیر تاتارخانیہ اور فتاوائے تاتارخانیہ فکری بحران کو روکنے کے مضبوط قلعے تھے۔

تقریباً ایک صدی بعد محمد بن احمد گجراتی (م ۸۲۰ھ) نے "کاشف الحقائق وقاموس الدقائق" سید محمد گیسو دراز رح (م ۸۲۵ھ) نے "تفسیر دُرر ملتقط" اور شیخ علی مہائمی (۸۳۵ھ / ۱۴۳۱ء) نے "تبصیر الرحمان وتیسیر المنان فی تفسیر القرآن" چار جلدوں میں لکھی۔ تینوں تفسیریں اپنے وقت کے رجحانات کی ترجمان ہیں۔ شیخ علی مہائمی رح وحدت الوجود میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اور یہ نظریات بھی ان کی تفسیر میں جو آیات کے باہمی ربط کی تحقیق میں بہت بیش قیمت معلومات سے پُر تھی، کسی نہ کسی طرح داخل ہو گئے تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب شطاری سلسلہ، بھگتی تحریک، مہدوی نظریات سب وحدت الوجود سے فکری تقویت حاصل کر رہے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ حضرت مجدد صاحب رح اس تفسیر کے مطالعہ کو پرخطر و پُرضرر سمجھتے تھے۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔

"کتاب تبصیر الرحمن کہ مرسل داشتہ بودند بعضے از مواضع آں مطالعہ نمودہ واپس فرستاد مگر مصنف ایں کتاب خیلے میل بمذہب فلاسفہ دارد و نزدیک است کہ حکیماں را عدیل انبیاء سازد ... مطالعہ ایں کتاب بے ضرر خفیہ نیست۔"

مجدد صاحب رح کی نظر نے ان پوشیدہ امکانات ضرر کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا جو اس النوع کی تفسیر کا لازمی نتیجہ تھے۔

پندرہویں صدی کی نہایت اہم تفسیری کوشش قاضی شہاب الدین دولت آبادی رح کی "بحر مواج" ہے۔ یہ سلطان ابراہیم شرقی کے نام معنون کی گئی تھی۔ اس میں خصوصیت سے نحوی تراکیب اور وصل وفصل کے مواقع سے بحث کی گئی ہے۔ اس بحث نے پوری کتاب میں ایک وضعیت اور تکلف کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح لکھتے ہیں۔

"از برائے سجع تکلف کردہ است، قابل اختصار و تنقیح و تہذیب است" (اخبار الاخیار ص۱۷۰)

صاحب گلزار ابرار کی یہ رائے کہ اگر عربی زبان میں یہ کتاب ہوتی تو کشاف کے ہم پہلو اس کو جگہ ملتی، مبالغہ سے خالی نہیں۔ منور علی لاہوری نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا تھا (الثقافۃ الاسلامیۃ ص۲۳) لیکن فطری اعتبار سے اس کو کوئی خاص مقام حاصل نہ ہو سکا۔

اس زمانہ میں قرآن کو کسی خاص لیکن محدود زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا رجحان بڑھ گیا تھا۔ حاجی عبدالوہاب بخاری نے تفسیر اس طرح لکھی کہ سارے قرآن کو منقبت رسول قرار دیدیا۔ (اخبار الاخیار)

پھر محمد بن احمد میاں جیو نے تفسیر محمدی صوفیانہ انداز میں لکھی اور ربط آیات پر خاص زور دیا۔

عہد اکبری میں تفسیری لٹریچر بالکل دوسرے ہی رنگ میں نظر آتا ہے۔ شیخ مبارک اور فیضی جنہوں نے اکبری دور میں ذہنی انتشار کو پھیلانے میں کافی حصہ لیا تھا، دونوں تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ شیخ مبارک نے اپنے پایان عمر میں جب قوت باصرہ نے جواب دیدیا تھا، اپنے حافظہ کی قوت سے چار جلدیں "منبع عیون المعانی" کی لکھوائیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کو تفسیر کبیر کے انداز پر قرار دیا ہے اور یہ شکایت بھی کی ہے کہ یہ اپنے مسلک کی تائید میں لکھی تھی۔ لیکن غالباً اس تفسیر میں کوئی ایسی راہ اختیار نہیں کی گئی جو عوام میں ناراضگی کا باعث بنے۔ ملا صاحب بھی اس پر رائے دینے میں محتاط نظر آتے ہیں۔

فیضی کی بے نقط تفسیر "سواطع الالہام" عربی زبان پر اس کی قدرت ضرور ظاہر کرتی ہے لیکن

ذہن کو تھکا دینے والے معموں سے پُر اور افادیت سے بیگانہ ہے۔ لیکن اس تفسیر کی بھی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ یہ فیضی کے افکار و معتقدات کو بے نقاب کرتی ہے۔ فیضی عمر بھر اکبر کے نظریات کی تعریف کرتا رہا، لیکن غالباً یہ سب کچھ اس نے اپنے ضمیر کے خلاف کیا تھا۔ یہ تفسیر اس نے اپنے عقائد کو حقیقی رنگ میں پیش کرنے کے لئے اس طرح لکھی تھی کہ اکبر کی نظر ان تک نہ پہونچ سکے، لیکن اس کے ضمیر کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ اس تفسیر میں فیضی قرآن کو آخری الہامی کتاب مان کر چلتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر ایمانِ کامل رکھتا ہے اور اسلام کو واحد سچا مذہب تسلیم کرتا ہے۔ یعنی وہ تمام مذہبی افکار جنہوں نے اکبر کے دربار میں پرورش پائی تھی۔ ان سے توبہ کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی اس کی اخلاقی جرأت سے محرومی اور خود غرضانہ مصلحتوں کو ظاہر کرتی ہے۔ اس ضمن میں اس کی سیرت کا تضاد مآثر الامراء کی اس روایت سے بھی ظاہر ہوتا ہے جس میں لکھا ہے کہ شہزادہ سلیم نے ایک بار اکبر سے کہا تھا کہ خود فیضی کے مکان پر تفسیر کا چرچا ہے، جب کہ دربار میں وہ دوسرے ہی رنگ میں نظر آتا ہے۔ اور اکبر نے اس پر طنز بھی کیا تھا۔ اگر ابو الفضل کا وہ خط پیش نظر ہو جو اس نے عبد الرحیم خاں خاناں کو لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا ہے تو اندازہ ہوگا کہ دونوں بھائیوں نے خوشامد اور درباداری کو ایک فن بنا کر اپنی مذہبی زندگی کو پریشان کر دیا تھا۔

بہرحال فیضی کی ادبی جادوگری سے متاثر ہو کر ایک دمشقی عالم سید محمود آفندی نے قسطنطنیہ سے ایک دُرر الاسرار شائع کی تھی (۱۲۲۴ھ)، ماہرین کا خیال ہے کہ وہ فیضی سے متاثر ہے۔ اور اسی کے بیانات کو اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اسی نوع کی ایک کوشش عبد الاحد بن امام علی الہ آبادی کی تھی۔ انہوں نے قرآن پاک کے آخری جزو کی تفسیر اس طرح لکھی کہ اس میں کوئی حرف غیر منقوط استعمال نہیں کیا۔ اس کا نام "فیض غیب" یا "جب شغب" رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی

تفسیریں فکری اعتبار سے کوئی اثر نہیں چھوڑ سکتی تھیں بلکہ ان کے ذریعہ قرآن کی تعلیم سے ایک طرح کا بُعد ہوتا رہا۔ لیکن اس وقت بعض مسائل جو درباری ماحول سے پیدا ہوئے تھے، ان کی اصلاح بھی ضروری تھی۔ چنانچہ بعض علماء کی تصانیف کا مقصد اس صورتِ حال کی اصلاح تھی۔ مولانا عبد النبی اکبر آبادی نے ۱۰۲۱ھ میں "دستور المفسرین" لکھی اور اس کو خان خاناں کے نام معنون کیا جو اس زمانہ میں دینی احساس رکھنے والے کا ملجا و ماویٰ تھا۔ اس دستور میں ناسخ و منسوخ سے بحث کی گئی ہے۔ اس زمانہ میں یہ مسئلہ بار بار ابھرتا تھا۔

اکبر نے جو نصابِ تعلیم وضع کیا تھا، اس میں بقول ابو الفضل "ہر طالب علم کے لئے ضروری تھا کہ اخلاق، حساب، سیاق، زراعت، اقلیدس، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاست مدن، طب، منطق، طبعی، ریاضی اور دنیا کی تاریخ وغیرہ علوم و فنون کی بتدریج تعلیم حاصل کرے۔" (ج ۱ ص ۱۸۱ اردو ترجمہ) اس نصاب سے جیسا کہ ظاہر ہے علوم دینی کو یکسر خارج کر دیا گیا تھا، بلکہ بقول ملّا بدایونی عربی کا مطالعہ بھی بُری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی تعلیم کی چار منزلیں ہوتی تھیں، ابتدائی منزل جس پر بہت سے مسلمان بچے شامل ہو جاتے تھے صرف قرآن پاک پڑھنے تک محدود تھی۔ اس طرح بچے نماز آسانی سے پڑھنے کے قابل ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد کی منزل میں معمولی فارسی کی تعلیم تھی۔ اس منزل پر رسائل کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھا دی جاتی تھیں۔ تیسری منزل میں باقاعدہ فارسی کی تعلیم ہوتی تھی۔ انشاء، اخلاق، حساب، سیاق وغیرہ مضامین تفصیل سے پڑھائے جاتے تھے اور اس منزل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد حکومت کی ملازمتوں کی اہلیت اور علمی مجلسوں سے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔ چوتھی اور آخری منزل پر اعلیٰ علوم، معقولات اور منقولات کی تعلیم ہوتی تھی۔ اور اسی منزل پر علم کا معیار اور تعلیم کی افادیت متعین ہوتی تھی۔ یہ تعلیم بیشتر عربی میں تھی۔

اکبر نے جو تعلیمی تجربہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ چوتھی منزل کی تعلیم کو بالکل ختم کر دیا جائے اور جو علوم اس منزل پر پڑھائے جاتے تھے ان کی تعلیم فارسی میں ہو اور تیسری منزل پر ہی ختم ہو جائے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر اس نے کتابوں کو فارسی میں منتقل کرانا شروع کر دیا تھا۔ علومِ اسلامی کے لئے یہ بڑا سخت وقت تھا، ابتلا اور آزمائش کا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فارسی ترجموں کا جو بیڑا اٹھایا تھا، وہ اکبر کی اس پیدا کردہ صورت حال کا ایک دوسری سطح پر مقابلہ کرنا تھا۔ مجدد صاحبؒ نے اس صورتحال کا مقابلہ اسطرح کیا کہ ایک طرف تو قرآن کی تفسیر سے وضعیت کے پردے اٹھانے کی جدوجہد کی دوسری طرف وحدۃ الوجود کے ناقابلِ فہم نظریات میں عوام کی دلچسپیوں کو روکا۔

فرانسیسی عالم برنیر جب ہندوستان آیا تو اس کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہاں وحدۃ الوجود کے ماننے والوں اور اس کے منکرین میں زبردست معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔ یہ اختلاف علمی حلقوں تک محدود نہ رہا تھا بلکہ محلاتِ شاہی تک پہونچ گیا تھا۔ اورنگ زیب اور داراشکوہ اسی اختلافِ فکر کی اہم ترین علامتیں تھیں۔ اگر اورنگ زیب کا تعلق خواجہ محمد معصومؒ، خواجہ سیف الدینؒ یعنی مشائخ سرہند سے تھا تو داراشکوہ ملا شاہ بدخشی، میاں میرؒ اور شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ کے دامن تربیت سے وابستہ تھا۔ دونوں مکتب فکر کی طرف سے قرآن کی نئی تفسیریں تیار کی گئیں۔ شاہ محب اللہ نے عربی میں کلام پاک کی تفسیر "ترجمۃ الکتاب" کے نام سے لکھی۔ اس کا قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری (۱۳۶۹) میں موجود ہے۔ اس کے ادق ہونے کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس تفسیر پر خود انہوں نے حاشیہ لکھا (انڈیا آفس لائبریری ۱۳۷۰) اسی میں قرآن پاک سے نظریہ وحدت الوجود کی تائید کی گئی ہے۔ ملا شاہ نے ۱۰۵۷ھ میں "شاہ تفسیر" (یا تفسیر شاہ) لکھی۔ اس کے نسخے بانکی پور، اور انڈیا آفس میں موجود ہیں۔ یہ وہی ملا شاہ ہیں جنہوں نے لکھا تھا (نقلِ کفر کفر نباشد)

پنجہ در پنجہ خدا دارم　　من چہ پروائے مصطفیٰ دارم

اورنگ زیب نے ان نظریات کی تردید میں قرآن اور فقہ کی تعلیم پر زور دینا ضروری سمجھا اور ان دونوں علوم میں ایک نئی جان ڈال دی۔ محمد امین صدیقی نے اس کے حکم سے "تفسیرِ امینی" لکھی۔ اس کا واحد نسخہ آصفیہ کتب خانہ میں ہے۔ نعمت خاں عالی نے "نعمتِ عظمیٰ" کے نام سے فارسی تفسیر تیار کی اور اورنگ زیب کے نام اس کو معنون کیا۔ محمد صفی بن ولی قزوینی نے زیب النساء کے نام پر "زیب التفاسیر" لکھی۔ اس کا خود مصنف کا لکھا ہوا نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں موجود ہے۔

عہدِ عالمگیری کے اس تفسیری ذخیرہ کا تقابلی مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مختلف نظریہ ہائے فکر کس طرح ٹکرا رہے تھے اور ان کی پرچھائیاں تفسیر میں نظر آنے لگی تھیں۔ ہر مکتب خیال اپنے اندازِ فکر کو فروغ دینے کے لئے کلام پاک کا سہارا تلاش کر رہا تھا۔ ملا جیون کی "التفسیرات الاحمدیہ فی بیان آیاتِ شرعیہ" کا مقصد ان آیات کی تشریح تھا جن سے کوئی حکم مستنبط ہوتا ہے۔ انہوں نے احکامِ شرعی کو واضح طور پر بیان کیا تاکہ عوام جو ضخیم کتابوں سے استفادہ نہیں کر سکتے وہ اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس کتاب کو انہوں نے اورنگ زیب کے نام معنون کیا۔ پھر قلی شاہ نے "مجمع الفوائد" اسی مقصد سے لکھی۔

ہندوستان میں قرآن کریم کی تعلیم کا سب سے اہم دور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے قرآن فہمی کو فروغ دینے میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ انکے سامنے تین اہم مسائل تھے۔

(۱) قرآن کی تعلیم سے عوام کا نابلد ہونا۔

(۲) وقت کے بدلتے ہوئے انداز جس میں نئے افکار تیزی سے بڑھ رہے تھے

اور ایک نئے علم کلام کی ضرورت واضح ہوتی جارہی تھی۔

(۳) مسلمان معاشرہ کا اسلامی روح سے دور ہوتے جانا۔

اس صورت حال کے مقابلہ کے لئے انہوں نے جو تدابیر اختیار کیں ان کے اثرات دور رس ہوئے۔ فتح الرحمن کے دیباچہ میں اعلان کرتے ہیں۔

دریں زمانہ کہ ما دراینم و دریں اقلیم	ہم جس زمانہ میں سانس لے رہے
کہ ماساکن آنیم نصیحت مسلمانان	ہیں اور جس ملک میں ہم ہیں وہاں
اقتضا میکند کہ ترجمہ قرآن عظیم	مسلمانوں کی بہتری کا تقاضا یہ ہے کہ
بزبان فارسی سلیس در روزمرہ اقلیم	قرآن عظیم کا فارسی ترجمہ روزمرہ کی
متداول بے تکلف فضیلت نمائی و	زبان میں تصنع اور عبارت آرائی سے
بے تصنع عبارت آرائی... تحریر کردہ	پاک تحریر کیا جائے تاکہ خاص و عوام
شود تا خواص و عوام ہمہ یکساں فہم	بڑے اور چھوٹے یکساں طور پر اس کو
کنند و صغار و کبار بیک وضع ادراک	سمجھ سکیں۔
نمایند۔ (ص ۱)	

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ اس کی سب سے زیادہ ضرورت اہل حرفہ اور سپاہیوں کے بچوں کو ہے کہ وہ علوم عربیہ سے بالکل نابلد ہیں۔ پھر اپنے وصیت نامہ میں بچوں کو عربی زبان سے مانوس کرنے پر زور دیتے ہیں تاکہ قرآن اور حدیث سے ان کی طبیعت کو مناسبت پیدا ہو جائے۔ پھر ہدایت کرتے ہیں کہ جلالین کا خاص طور پر مطالعہ کیا جائے۔ جلالین کی خوبی یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے اور پڑھنے والے کے ذہن کو لایعنی بحثوں میں نہیں الجھایا گیا۔

اگر شاہ ولی اللہؒ کی فکر کا رخ، ان کے نظریات کی گیرائی اور گہرائی نظر میں ہو تو اندازہ ہوگا کہ دور اکبری

میں علوم دینیہ میں جو شدید ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اس کو شاہ ولی اللہؒ نے اس تدبیر سے حل کیا کہ قرآن کی تعلیم کو خاص و عام کے لئے کھول دیا۔ شاہ صاحبؒ نے یہ محسوس کیا کہ جو فکری انتشار فلسفہ، منطق، کلام، تصوف کے سہارے پھیلایا جاتا ہے اس کے سدباب کا ذریعہ صرف فہم قرآن ہے۔ اقبال کی زبان میں ان کا مطمح نظر یہ تھا۔

فکر را روشن کن از ام الکتاب

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے تھے کہ قرآن پاک پڑھاتے وقت، حدیث کے مقابلہ میں انکشافات زیادہ اور معنی خیز ہوتے ہیں۔

"مردماں چنانچہ در قرآن متلذذ	لوگ جتنا قرآن سے لذت گیر ہوتے
می شوند در حدیث نہ، و مارا ہم	ہیں اتنی لذت ان کو حدیث میں نہیں
چنانچہ در قرآن معنی ہائے عجیب و غریب	ملتی اور خود ہمارا حال بھی یہی ہے کہ
دست می دہد و آمدی باشد در حدیث	جتنے عجیب و غریب مطالب قرآن میں ہاتھ
نہ، در حدیث موافق کتب بیان می	آتے ہیں اور اس میں آمد معلوم ہوتی ہے
کنم"	حدیث میں یہ بات حاصل نہیں ہوتی۔
(ملفوظات ص ،)	حدیث کے درس میں تو وہی بیان کرتا
	ہوں جو کتابوں میں ہے۔

شاہ صاحب کا ترجمہ اسلامی فکر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے بیٹوں شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے اردو میں ترجمے کر کے اس تحریک کو مزید تقویت پہنچائی۔ مولانا سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے زمانہ میں شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی مقبولیت اور اس کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب لکھتے ہیں "جو شخص

قرآن کے لفظ لفظ میں تیرے، وہی فتح الرحمٰن کی قدر جان سکتا ہے"۔ (ص ۵)

"فتح الرحمٰن" کو ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی منتقل کرنے کی کوشش کی گئی۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں لاہور سے محمد بن برک اللہ نے پنجابی زبان میں، سنہ ۱۸۶۱ء میں پشتو میں بھوپال سے، سنہ ۱۹۰۲ء میں سندھی زبان میں شائع کیا گیا۔ سنہ ۱۲۹۳ھ میں ترکی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔

پھر نئے افکار کا مقابلہ کرنے کے لئے شاہ ولی اللہؒ نے "اسرارِ دین" کو اس طرح پیش کیا کہ ان تمام علوم کی جھلک ان کی حجۃ اللہ البالغہ میں نظر آنے لگی جو بعد کو یورپ میں مدون ہوئے۔ SOCIOLOGY کی اصطلاح AUGUST COMTE نے انیسویں صدی میں استعمال کی تھی اس کی پیدائش سے ۳۵ سال قبل شاہ ولی اللہؒ نے وفات پائی۔ لیکن انہوں نے جس طرح سماجی ارتقاء، ارتفاقات، سماج کے امراض، ان کی تشخیص، ان کے علاج پر قرآن کی روشنی میں بحث کی ہے وہ ان کی عمرانی بصیرت کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے ان علوم سے اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کا کام لیا۔

(۳) شاہ صاحبؒ کی نظر میں عربی روح کو بیدار کرنا تمام ملّی عوارض کا علاج تھا۔ انہوں نے اس کام کے لئے موطا کا انتخاب کیا۔ ان کا خیال تھا کہ امام مالک حجازی فکر اور عربی مزاج سے قریب تر تھے اور ان کے موطا کے ذریعہ اس روح کو بیدار کیا جا سکتا تھا۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے بعد ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں کلامِ پاک کے ترجمے ہوئے۔ حال ہی میں استنبول سے عصمت بنارک اور رلیت ایرن نے قرآن پاک کے مختلف زبانوں میں تراجم کی ایک گرانقدر فہرست شائع کی ہے۔ اس فہرست کے مطالعہ اور تجزیہ سے ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں قرآن پاک کے ترجموں کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔ علی الترتیب سندھی، پنجابی، پشتو، گجراتی میں سب سے زیادہ ترجمے ہوئے۔ عمرانی کیفیات، سماجی تقاضوں، اور ملی ضروریات و احساس کا اگر تقابلی مقابلہ کیا جائے تو بہت سی حقیقتیں

سامنے آئیں گی اور قرآن فہمی میں عوام کی دلچسپی کے اسباب پر نئی روشنی پڑے گی۔

انیسویں صدی میں علومِ قرآن ہندوستان میں

ہندوستان کی تاریخ میں اتنے ترجمے اور تفسیریں کبھی شائع نہیں ہوئیں جتنی انیسویں صدی میں۔ اس کے پیچھے بعض اہم سیاسی، سماجی اور مذہبی اسباب و عوامل کارفرما تھے۔ جن کے تجزیہ کے لئے ذرا وسیع پس منظر میں صورتِ حال کا جائزہ لینا ہوگا۔

۱۹ ویں صدی میں اگر ایک طرف مسلمانوں کے سیاسی ادارے تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہے تھے تو دوسری طرف سامراجی قوتیں سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی علوم، بالخصوص سائنس نے فکر و نظر کی نئی دنیا پیدا کر دی تھی۔ سقوطِ بغداد کے بعد اتنی پریشان کن صورت کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ بلکہ صورتِ حال شاید اس سے کہیں زیادہ تشویشناک تھی۔ منگولوں نے تباہی و بربادی تو مچادی تھی لیکن کوئی نئی تہذیب یا کچھ ان کے پاس نہیں تھا، علوم و فنون کا تو ذکر ہی کیا۔ انہوں نے جسمانی قوت اور بربریت کے سہارے مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی اداروں کو نقصان پہنچایا تھا، خود ان کا دامن خالی تھا۔ اب صورتِ حال کی نوعیت اور اسکے امکانات (DIMENSIONS) مختلف تھے۔ انگریزی اقتدار کے پہلو بہ پہلو نئے علوم، نئے زاویہ ہائے فکر اور نئے سائنسی انکشافات دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ مسلمانوں کے مختلف طبقوں نے اس صورتِ حال کے مقابلے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ ایک جماعت نے اس انقلاب اور تغیر کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اور اس دل خوش کن غلط فہمی کا شکار رہے کہ وقت کا قافلہ انہیں متاثر کئے بغیر گزر جائے گا۔ دوسری جماعت نے وقت کے اشاروں کو سمجھا، لیکن مقابلہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کی راہ اختیار کی۔ ہندوستان میں سر سید، ترکی میں سلطان محمود خاں اور اس کے وزیر فواد پاشا، مصر میں

محمد علی پاشا، تیونس میں خیرالدین صاحبِ "اقوم المسالک" اور بیرم تیونسی صاحب "صفوۃ الاخبار" نے اس مسلک کو اختیار کیا۔ اور اپنے سارے مسائل ومصائب کا علاج مغربی علوم اور تمدن کے اختیار کرنے میں محسوس کیا۔ پھر ایک جماعت تھی جس میں مولانا جمال الدین افغانی اور مدحت پاشا (ترکی) کو شمار کیا جا سکتا ہے جس نے سیاسی اقتدار کی بازیافت کو ہر دوسری کوشش پر مقدم قرار دیا۔ پھر ایک جماعت ایسے علمار کی بھی تھی جو دین کو بچانے اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے کوئی مفاہمت کسی سطح پر پسند نہیں کرتی تھی۔

ہندوستان میں اس صورت حال سے جو کشمکش پیدا ہوئی اس کے بنیادی خطوط یہ تھے۔

(۱) مغلیہ سلطنت کا خاتمہ صرف ایک سیاسی نظام کا خاتمہ نہ تھا، بلکہ ایک ایسی تہذیب کی جان کنی تھی جس نے فکر ونظر کے سانچے ڈھالے تھے اور زندگی کو ایک رنگ و روپ بخشا تھا۔ اس کے خاتمہ سے ایک خلا پیدا ہوگیا۔ جس کا پُر کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت تھی۔

(۲) مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی تیلیاں جس ڈورے سے بندھی تھیں وہ ٹوٹ گیا۔ نئے معاشی حالات نے مدارس ومکاتب کی مدد کے وہ تمام سوتے بند کر دیئے جن کے سہارے وہ قائم تھے۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے اس صورت حال کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

(۳) انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے ساتھ عیسائی مشنری تحریکوں کا ایک جال سارے ملک میں پھیل گیا تھا اور عیسائی مبلغین کو ہندوستان میں ایک زرخیز میدان نظر آنے لگا تھا۔

(۴) سائنس کے ایک نئے دور کے آغاز نے زندگی کے ہر شعبہ پر اثر ڈالا۔ سائنس کے اپنے مطالبات تھے، اور جیسا کہ دنیا کی تاریخ میں ہر جگہ ہوتا رہا ہے، سائنس کا پہلا معرکہ مذہب سے ہوا۔ یورپ میں اس معرکہ کی تصویر Draper نے CONFLICT BETWEEN

RELIGION SCIENCE میں بڑی دیدہ وری سے کھینچی ہے۔

(۵) مذہب کے مقصد ومنہاج کے متعلق نئے انداز سے گفتگو ہونے لگی۔ کتب آسمانی کے متعلق نئی بحثیں پیدا ہوگئیں۔ ہر مذہب اپنی کتاب کی برتری ثابت کرنے لگا۔ اناجیل و قرآن بحث ومباحثہ کا موضوع بن گئے۔

(۶) پھر انگریزوں کی کوشش نے مسلمان عیسائی مباحثوں کا رخ ہندو مسلمان مناظروں کی طرف پھیر دیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں اس نوعیت کی مذہبی کشمکش اب تک دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

(۷) اس صورت حال میں بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ "اُم الکتاب" میں ان کے لئے کیا رہبری ہے؟ اور قومی انحطاط کو روکنے اور عظمتِ رفتہ کی بازیافت میں قرآن کیا مدد کر سکتا ہے۔

(۸) خود مسلمانوں میں بعض نئے فرقے، نئے طرز فکر اور نئے زاویہ ہائے نظر کے ساتھ پیدا ہوئے۔ اہلِ قرآن نیچر، قادیانی، بابی وغیرہ۔ اور ان میں سے ہر ایک نے قرآن ہی کو اپنے عقیدہ کی بنیاد قرار دیا، اور اپنے مقصد کی تفسیریں تیار کرنی شروع کر دیں۔ بقولِ اقبال:-

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر — چاہے تو خود ایک تازہ شریعت کرے ایجاد

(۹) مسلمانوں میں روح عمل کو سرد کرنے اور غلامی کا سبق پڑھانے کے لئے ایک طرف "جہاد" کا تصور مذہبی فکر سے نکالنے کی کوشش کی گئی۔ دوسری طرف ان سب مسائل نے تفسیر کے میدان میں علمار کی جدوجہد کا رخ متعین کیا۔

اس دور کا سارا تفسیری اور مذہبی لٹریچر ان مسائل کے عمل ورد عمل کی عکاسی کرتا ہے، یہاں صرف ان چند تفسیروں اور ترجموں کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے جو اس ذہنی کیفیت

کی ترجمانی کرتی ہیں۔

(۱) اس دور کی سب سے اہم تفسیر حکیم محمد حسن امروہوی کی "تفسیر معالمات الاسرار فی مکاشفات الاخبار" (عرف تفسیر شاہی) ہے۔ مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم نے اس تفسیر کو بہترین تصنیف قرار دیا ہے (ثقافة الاسلامیہ ص ۲۳۵) اس تفسیر میں تمام کتب سماوی کا جتنا عمیق اور سنجیدہ مطالعہ کیا گیا ہے وہ اس دور کے لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ یہ تفسیر ہندوستان میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی پہلی سنجیدہ کوشش تھی، جس کی بنیاد تحقیق، مطالعہ اور دیانت داری پر تھی۔ اس تفسیر نے مسلمانوں کو اس ذہنی مرعوبیت سے نجات کا راستہ دکھایا جو مذاہب عالم کے مطالعہ سے بے خبری کا نتیجہ تھی۔ خود تفسیر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ان مباحث کی وجہ سے جو اس وقت دوسرے مذاہب نے شروع کر دیئے ہیں۔

"پس اہل علم را ملاحظہ کتب سابقہ لازم آمد، بدیں وجہ خواستم کہ اہل اسلام برادران دینی را برانچہ اطلاع یافتہ ام موافق یا سنت سلف کہ رافع وہمیات و شک و شبہات اہل کفر و نفاق و فلاسفہ یونان و یورپ و ہندیان باشد خبردار سازم۔" (ص ۴)

(۲) سرسید نے "خطبات احمدیہ" لکھ کر جس طرح میور کا مقابلہ کیا تھا، اور مستشرقین کے حملوں سے مدافعت کا سامان مہیا کیا تھا، اور تلاش و تحقیق کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تھا، وہ اپنی جگہ لائق ستائش و اعتراف ہے، لیکن تفسیر قرآن میں انہوں نے جو رنگ اختیار کیا وہ مغربی علوم سے ذہنی مرعوبیت کو ظاہر کرتا ہے۔ مذہب اور سائنس کے معرکہ میں وہ اس طرح داخل ہوئے کہ سائنس کے نظریات کو مذہب کے مطابق ثابت کرنے کے لئے وہ توجیہات کیں جو ناقابل قبول بھی تھیں اور غیر ضروری بھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ابتدائی زمانہ میں سرسید کی تفسیر

سے بہت متاثر ہوئے تھے، وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کا استدلالانہ اندازِ گفتگو ان کے اس وقت کے مزاج کے مطابق تھا، لیکن جب "ترجمان القرآن" لکھنے کا وقت آیا تو فکر و نظر کے زاویے بدل چکے تھے۔ انہوں نے سرسید کا نام لئے بغیر ان کے طرز فکر کی پوری مخالفت کی ہے اور لکھا ہے کہ سائنس کی THEORS دن رات بدلتی رہتی ہیں۔ مذہب کو ان کے مطابق مسلسل ڈھلتے رہنا خطرناک تجربہ ہے۔ مذہب اور سائنس دونوں کے میدان علیحدہ علیحدہ ہیں۔

وضعیت اور توڑ مروڑ کر مطابقت پیدا کرنے سے روح قرآنی تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ روح عصر کی جھلک تفسیر میں آئے بغیر نہیں رہتی۔ خود مولانا آزاد کے ترجمان القرآن میں یورپ کی UTILITARIAN UNITARIAN HU-MANITARIAN اور دوسری اسی نوعیت کی تحریکوں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن سرسید اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں کی تفسیروں کا نامکمل رہ جانا محض اتفاقی نہیں تھا، جس طرح انہوں نے مخصوص نقطہ ہائے نظر سے اپنی تفسیروں کو اٹھایا تھا، اس کو آخر تک لے جانا آسان نہ تھا! قرآن انسان کو تفکر کی دعوت ضرور دیتا ہے اور دل کی آنکھیں کھول کر کائنات ہستی کے راز کو سمجھنے کی ہدایت کرتا ہے، لیکن کسی فکری سانچے، یا تھیوری میں، خواہ وہ سائنس کی ہو یا عمرانیات کی، یا سماجیات کی، ڈھالنے کا روادار نہیں۔

(۳) نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) کی "فتح البیان فی مقاصد القرآن" اہم تفسیر ہے۔ نواب صاحب علمائے اہل حدیث میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ اتحاف النبلاء میں انہوں نے بعض علماء اور مذہبی تحریکوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ "فتح البیان" پر ان خیالات کا اثر پڑنا ناگزیر تھا، لیکن وہ بیحد محتاط مفسر تھے۔

(۴) مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی نے اپنے ترجمہ کا جواز صرف زبان کی روشنی میں پیش

کیا ہے، لیکن محاوروں میں غیر معمولی دلچسپی نے بعض جگہ کچھ اچھا اثر نہیں ڈالا۔ انہوں نے افکار و عقائد سے زیادہ الفاظ و محاورات پر زور دیا ہے لیکن ان کی تعلیم قرآن پاک سے متعلق کتابیں ۔ "الحقوق والفرائض"، "اجتہاد" "مطالب القرآن"۔ اس فکری کیفیت کی ترجمان ہیں جو اس دور کا خاصہ ہے۔ نزولِ قرآن کی اصل غرض بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں، خیالات کی اصلاح، معاملات کی اصلاح اور امن و عافیت۔ اس آخری فقرہ کی اہمیت کو سمجھنا مشکل نہیں۔

(۵) مولانا ثناء اللہ امرتسری کی "تفسیر ثنائی" میں جہاں اہل حدیث کا نقطۂ نظر کارفرما ہے، وہاں عیسائی مشنریوں، آریہ سماجیوں، اور قادیانیوں کی تردید بھی پیشِ نظر رہی ہے۔ انہوں نے سرسید کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے، لیکن ان کی فہرست مطالب بالکل سرسید کی تفسیر کے رنگ پر ہے۔ سرسید نے "سنت اللہ" پر جس طرح زور دیا ہے، مولانا ثناء اللہ وہی بات دوسرے انداز میں کہتے ہیں۔

مختلف مذاہب، بالخصوص عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے مباحثوں کی کیفیت کا اندازہ قرآن پاک کے اس مطبوعہ نسخہ[1] سے لگایا جا سکتا ہے جس میں شاہ رفیع الدین، مولانا تھانوی اور مولانا ممتاز علی کے ترجموں سے استفادہ کیا گیا ہے، اور شروع میں تمام وہ اعتراضات جمع کر دیئے ہیں جو عیسائی اور آریہ سماجی قرآن پاک پر کرتے تھے۔

(۶) مولانا ممتاز علی کی "تفصیل البیان فی مقاصد القرآن" سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں فرقوں کی افزائش سے پیدا شدہ حالات ان کے پیش نظر تھے، وہاں ملی ضروریات بھی زیر غور تھیں۔ اور وہ قرآن کی تعلیم میں قومی انحطاط کا علاج تلاش کرتے تھے۔ لکھتے ہیں،

"قومی انحطاط کے بواعث اور ترقی کے وسائل کی طرف (قرآن مجید) میں

---

[1] متوسط قرآن شریف نعمانی، ریاض الدین تاج الدین مالکان مطبع نعمانی، دہلی ۱۳۵۱ھ ص ۸-۱

بار بار توجہ دلائی ہے ... ولولۂ عمل پیدا کرنے والا یہ اندازِ تخاطب کتب حدیث میں نسبتاً کم اور کتب فقہ میں بالکل ناپید ہے۔" (ص ۲)

انہوں نے وقت کا خیال رکھتے ہوئے آیاتِ قرآنی کی ترتیب میں بعض ایسے عنوانات قائم کئے جیسے سرمایہ داری کی مذمت۔

۱۹۰۷ء میں تفسیر القرآن محمد انشاء اللہ ایڈیٹر وطن نے لاہور سے شائع کی تو لکھا۔

"غیر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی پستی و ذلت کا باعث قرآن اور شریعتِ اسلام ہے۔ اسلام مانع ترقی دنیا ہے مسلمان جب تک اس تنگ و تاریک مذہب سے دست بردار نہ ہوں گے وہ ہرگز دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے۔ غیر تو غیر رہے اب تو مسلمانوں کو باور نہیں آتا کہ خدائی قانون قرآن مجید اور اسلام کی تعلیم کو انسانی تہذیب و تمدن سے کچھ علاقہ ہے۔" (ص ۱۰)

چنانچہ اس تفسیر میں انہوں نے تہذیب و تمدن کے نقطہ نظر سے اسلام کی تعلیم کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا حمید الدین فراہی ۱۳۴۹ھ کی "نظام القرآن و تاویل الفرقان" اہم تصنیف ہے۔ انہوں نے آیتوں کے ربط پر زور دیا ہے اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ ان کے یہاں الفاظ اور SEMANTICS پر گفتگو خاص طور پر بصیرت افروز ہے۔ اگر یہ کوشش کچھ اور بڑھ جاتی تو قرآن کے مطالعہ کے اہم پہلو سامنے آجاتے۔ اور مشہور جاپانی مستشرقین TOSHIHIKO IZUTSU وغیرہ کی کوششیں جو انہوں نے اب شروع کی ہیں پیچھے رہ جاتیں[1]۔

---

[1] مثلاً اس کی کتاب God and man in the koran - Semantics of the koranic weltanschawing Tokyo 1964.

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے قرآن کے ترجمہ کے علاوہ بعض کتابیں تفہیم قرآن سے متعلق لکھی ہیں جو ان کے مخصوص انداز میں عصرِ حاضر کے بعض مسائل کو چھوتی ضرور ہیں، لیکن ان میں تفصیل سے داخل ہونا مناسب نہیں سمجھتیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تفسیر قدیم و جدید نقطہ ہائے نظر کی دلچسپ آمیزش کو ظاہر کرتی ہے۔ انہوں نے ایک طرف علامہ آلوسی بغدادیؒ کی تفسیر "روح المعانی" امام رازیؒ کی "تفسیر کبیر" اور مولانا تھانویؒ کے ترجمہ سے رہبری حاصل کی ہے تو دوسری طرف اپنی تحقیق کی تائید میں مستشرقین کوہن، ہٹی، جوزیفس اور ENCYOlOPAEDIAS کے حوالے بھی کثرت سے دیئے ہیں۔ یہ انداز بھی ایک عصری رجحان کا ترجمان ہے۔ تحت الشعور میں غالباً یہ خیال کام کر رہا ہے کہ مغربی مصنفین کی تائید ہی سے دلائل میں مضبوطی پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن مولانا کی تائید میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے جہاں مغربی مفکرین کے حوالے دیئے ہیں وہاں ان حوادث و واقعات کی تاریخی تحقیق زیرِ بحث ہے۔ مولانا دریابادی نے ان تین تفسیروں سے جو نقطہ نظر میں مختلف ہیں، بڑی ذہانت سے تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا عبداللہ العمادی نے "فلسفۃ القرآن" میں قرآن اور فلکیات پر جس طرح گفتگو کی ہے وہ بہت دلچسپ ہے لیکن اس میں جو جذبہ کارفرما نظر آتا ہے وہ بھی تطبیقی کا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن میں عصری تقاضوں اور قدیم و جدید افکار کے درمیان نہایت احتیاط سے راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"میں جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں وہ اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں"۔ اور اس مقصد میں وہ یقیناً کامیاب ہیں۔ کہتے ہیں کہ بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ کتاب محض علم تاریخ اور فلسفہ عمران کے طلبہ ہی کے لئے نازل ہوئی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سب نظریات کہیں نہ کہیں ان کی تفسیر میں جھانکتے نظر آتے ہیں۔ کوئی مصنف کتنا ہی عصری افکار و نظریات سے بے تعلق ہونا چاہے حالات گرد و پیش سے بیگانگی اختیار نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے عصری تقاضوں کو نظرانداز کرنے کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ انہوں نے صرف خالصتاً علمی اور سائنسی تحقیقات سے صرفِ نظر کیا ہے۔

یہ گفتگو نامکمل رہے گی اگر قادیانیوں کی تفسیری کوششوں اور ترجموں کا ذکر نہ کیا جائے۔ شاید ہی کسی فرقے نے قرآن کی تعلیم کو اس انداز سے اپنے عقائد کی تائید میں اس طرح پیش کیا ہو جیسے قادیانیوں نے۔ ان کے عقائد کی تردید میں تو کافی وقیع لٹریچر ملتا ہے لیکن قرآن کی تفسیر اور ترجموں کے ذریعے انہوں نے اپنے عقائد کو جس طرح خاموشی سے رواج دینا چاہا ہے اس پر سیر حاصل کام نہیں ہوا۔

بعض مصنفین نے مکمل تفسیریں تو نہیں لکھیں لیکن قرآن پاک کے بعض علمی پہلوؤں اور عملی ہدایات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی حیثیت مستقل تصانیف تفسیر ہی کی ہو گئی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر صادق علی کی "البرہان علیٰ اعجاز القرآن" (راولپنڈی ۱۳۱۴ھ) یا مولانا انور شاہ کشمیری کی "مشکلات القرآن"۔

بعض ترجمے اور تفاسیر جن میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ترجمہ، عبدالحق حقانی کی "تفسیر فتح المنان" مولانا عاشق الٰہی کا ترجمہ، مولانا فتح محمد خاں کا ترجمہ اور خواجہ حسن نظامی

کا ترتیلی ترجمہ شامل ہیں، اہم علمی کارنامے ہیں، جن سے قرآن فہمی کا چرچا ہوا ہے۔ شیخ الہند رح نے حقیقتاً شاہ عبدالقادر دہلوی رح کے ترجمہ کو زیادہ صاف زبان میں پیش کر دیا ہے۔ خود لکھتے ہیں۔

"میں نے ترمیم صرف دو امر میں کی ہے۔ اوّل لفظ متروک کو بدل دینا اور کہیں کہیں حسب ضرورت اجمال کو کھول دینا۔"

اس ترجمہ پر کچھ حواشی تو خود شیخ الہند نے لکھے تھے، لیکن ان کی تکمیل مولانا شبیر احمد عثمانی نے کی۔

یہاں سب تراجم اور تفاسیر کی فہرست پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف ان چند تصانیف و تراجم کی نشاندہی کی گئی ہے جو فکری رجحانات کی عکاسی، تائید یا تردید کی صورت میں کرتی ہیں، اور جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کیا معاصرانہ محرکات ان تفاسیر کی ترتیب میں اثر انداز ہو رہے تھے۔

مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم کے جو اثرات معاشرہ پر قائم ہونے لگے تھے ان سے تحفظ کے لئے شیخ الہند مولانا محمود حسن رح، نواب وقار الملک، اور حکیم اجمل خاں نے قرآن کی تعلیم کو عام کرنے کی مختلف تدابیر سوچیں۔ اور "نظارة المعارف" کی بنیاد ڈالی۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن کی تعلیم کے ذریعہ خود بخود نئے فکری اثرات سے تحفظ کے قلعے تعمیر ہو جائیں گے۔

مغربی تہذیب، فلسفہ اور مادیت کے خلاف جس شخص نے سب سے زیادہ موثر آواز اٹھائی وہ شخص تھا جس نے مغربی علوم کے حصول میں اپنی زندگی کے بہترین سال صرف کئے تھے۔ علامہ اقبال رح نے جس یقین، ایقان اور اعتماد کے ساتھ قرآن پاک کی روشنی میں تجدید و

احیاء کی راہیں تلاش کیں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اقبال نے کوئی تفسیر نہیں لکھی، لیکن سرورِ کائنات ﷺ کے حضور میں انہوں نے عرض کیا ہے کہ:

گر دلم آئینہ بے جوہر است — ور بحرفم غیر قرآں مضمر است

تو اس کی سزا یہ دی جائے۔

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

جو لوگ اقبال کے عشقِ رسول کی کیفیت کو سمجھتے ہیں وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ شعر ان کے اعماقِ روح سے نکل کر ان کی ذہنی کاوشوں کا ترجمان بن گیا ہے۔ اقبال نے قرآن کی روشنی میں مسلمانوں کو جینے کا راز سمجھایا اور اعلان کیا کہ "پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است" "یہ نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات ہے۔" اس کے بغیر جینا ممکن نہیں۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

جب کہیں سے آواز آئی کہ قرآن دورِ حاضر میں مکمل رہنمائی نہیں کر سکتا تو اقبال نے جواب دیا۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب — کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

اقبال کو شکایت تھی کہ قرآن سے ترکِ جہاں اور رہبانیت کی تعلیم اخذ کرنے میں روحِ قرآن کو مسخ کیا گیا ہے ۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

جب کوئی فکری تحریک یا عصری رجحان عام ہونے لگتا ہے تو طبیعتیں خود بخود اس طرف راغب ہو جاتی ہیں کہ ان کے مذہب کی تفسیر و تعبیر بھی اس طرح کی جائے کہ زمانہ کے

بدلے ہوئے حالات سے مغائرت نہ پیدا ہو اور مذہبی حقیقتوں پر اثر نہ پڑے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر شاہ ولی اللہؒ نے لکھا تھا۔

"نصیحت و نیک خواہی مسلمانان در ہر زمان و در ہر مکان رنگے دیگر دارد و اقتضائے دیگرے بنماید"۔ دریں زمانہ کہ ما دراں نیم و دریں اقلیم کہ ما ساکن آنیم نصیحت مسلمانان اقتضا می کند کہ ترجمہ قرآن بزبان فارسی تحریر کردہ شود" (ص ۱)

لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہ سمجھے کہ آنے والی نسلیں تفسیر بالرائے سے کام لے کر قرآن کی تعلیم کو زمانے کے رجحانات کے سانچہ میں ڈھال دیں۔

آہ محکومی و تقلید و زوال تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

حقیقتاً وضعیت اور فلسفیانہ موشگافیاں کلام اللہ کی روح تک نہیں پہونچنے دیتیں۔ قرآن خود تفکر کی ہدایت کرتا ہے لیکن استدلال سے منع کرتا ہے کہ یہ دل کے دروازے بند کر دیتا ہے، وضعیت کی غلام نظر، تشکک سے لبریز دل، کلام اللہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحب کشاف

تاریخ ارض القرآن (حصہ اول دوم)

حصہ اول میں عرب کا قدیم جغرافیہ عاد و ثمود و سبا، اصحاب لایکہ، اصحاب الحجر اور اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی و اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ دوسرے حصہ میں قرآن مجید میں مذکور قوموں مدین، اصحاب لایکہ، ایوب بنو اسماعیل اصحاب الرس، اصحاب الحجر، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر بحث ہے۔

قیمت حصہ اول ۲۴ روپے دوم ۱۸ روپے

سرسید، شبلی اور مغرب

از
ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

(۱)

جوادالدولہ عارف جنگ، سید احمد خاں اوائل عمر میں ایک نہایت قدامت پسند شخص تھے۔ ان کی ابتدائی تصنیف ("جام جم" ۱۸۴۰ء۔ "آثار الصنادید": ۱۸۴۷ء۔ "قول متین در ابطال حرکت زمین": ۱۸۴۸ء۔ اور "رسالہ راہ سنت در رد بدعت": ۱۸۵۰ء) کے موضوعات اور ان کے آرائشی اسلوب ہے سرسید کی ذہنی قدامت پسندی کے ساتھ ان کی طبیعت کے جوش، غلو، شدت اور انتہا پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے "آئین اکبری" پر مرزا غالب کی تقریظ اس لیے واپس کرائی کہ اس میں انگریزوں کی صنعتی ترقی اور سائنسی ایجادوں کا ذکر تھا۔ انھیں غالب کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔

صاحبانِ انگلستان را نگر
شیوہ و انداز اینان را نگر

تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند
آنچہ ہرگز کس نہ دید آوردہ اند

داد و دانش را بہم پیوستہ اند
ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند[2]

اس دور میں، ہرچند کہ وہ سرکارِ انگلشیہ کی ملازمت میں تھے اور انگریزوں سے وفادارانہ ربط و ضبط بھی رکھتے تھے، مگر ذہناً و فکراً: "سر سے پیر تک قدامت پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے"[3]۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ بہت سے دوسرے

ہندوستانیوں کی طرح انھوں نے بھی انگریزی تسلط کو "خدا کی مرضی" سمجھ کر قبول کر لیا تھا بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر، وہ انگریزوں کی وکالت بھی کرنے لگے تھے۔ ان کی ذہنی تبدیلی کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ بعض دیگر تحریروں میں بھی وہ بہت نمایاں طور پر انگریزوں کی طرفداری کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے نواب محمود خاں کو نامحمود خاں قرار دیا اور بہادر شاہ ظفر کو "معزول کم بخت بادشاہ" کا لقب عطا کیا۔ تحریک آزادی کے دیگر مجاہدین کو سرسید نے بدمعاش، بدذات، مفسد، نمک حرام، کم بخت اور حرام زادے جیسے الفاظ سے یاد کیا۔[۳۲] ان کا یہ خیال روز بروز پختہ ہوتا گیا کہ انگریزوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قربت و یگانگت ہی سے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

سفر انگلستان (۱۸۶۹ء) مغرب سے ان کی مرعوبیت کے لیے سونے پر سہاگہ ثابت ہوا۔ قیام انگلستان کے زمانے میں انھیں لندن "بہشت" محسوس ہوا اور وہاں کے "لوگ" با اخلاق اور سادہ مزاج اور بے غرور۔ محسن الملک کے نام ایک خط میں سرسید نے لکھا کہ اگر انگریز اپنے مقابلے میں ہندوستانیوں کو "مثل جانور کے"[۳۳] سمجھتے ہیں تو یہ غلط نہیں۔ لندن میں سرسید کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ ان کا طرز عمل بھی مودبانہ اور نیازمندانہ تھا۔ ملکہ کے دربار میں حاضری دینے گئے تو وہاں انھوں نے: "مثل تمام درباریوں کے اپنے نمبر پر سامنے جا کر سلام کیا۔۔۔ [اور] ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر اور بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔"[۳۴] وزیر ہند نے ایک خاص تقریب میں انھیں اپنے ہاتھ سے "سٹار آف انڈیا" کا تمغا پہنایا۔ ملکہ نے سی ایس آئی کا خطاب بھی عطا کیا۔ محسن الملک کے نام ایک خط میں فخریہ لکھتے ہیں: "اب میں احباب کی دعا سے سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی ہو گیا ہوں۔"[۳۵] اس غیر معمولی قدر و منزلت کا ان کے دل و دماغ پر بہرحال گہرا اثر ہوا۔ انگریزوں سے وفاداری کے جذبات مزید پختہ ہو گئے۔ انگلستان کے

سترہ ماہی قیام کے بعد جب وہ واپس ہندوستان پہنچے تو: "ظاہری وضع قطع کی طرح، ذہن اور فکر کے اعتبار سے بھی اب وہ ایک نئے انسان تھے۔"[۳۶]

انگلستان سے واپس ہندوستان پہنچ کر انھوں نے سٹیل اور ایڈیسن کی تقلید میں "تہذیب الاخلاق" جاری کیا، جس کا مقصد ہندوستانیوں کو "کامل درجے کی سولیزیشن"[۳۷] سکھانا تھا۔ "تہذیب الاخلاق" کے اجراء کے ساتھ اپنے ہمہ گیر اصلاحی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے انھوں نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا اور اگلے سال ملازمت سے پنشن لے کر خود کو مدرسے کی ترقی کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی تمام تر اصلاحی اور تعلیمی کاوشوں کا مقصد مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو ان کے ایک قریبی رفیق محسن الملک کے بقول: "از روے مذہب مسلمان ہو، از روے خون و رنگ ہندوستانی ہو، مگر بہ اعتبار مذاق، راے اور فہم کے انگریز ہو۔"[۳۸]

سرسید احمد خاں نہایت نیک نیتی کے ساتھ مسلمانوں کی بھلائی اسی میں سمجھتے تھے کہ وہ انگریزی طور طریقے اختیار کریں، مغربیت کی راہ اپنائیں اور انگریزوں کی وفادار رعایا بن کر رہیں۔ بہ الفاظ مولانا سید سلیمان سرسید چاہتے تھے کہ: "مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں۔"[۳۹] برطانوی حکومت کا باقی رہنا اور اس کا مستحکم ہونا، سرسید کی پرخلوص رائے میں مسلمانوں کے لیے نہایت مفید اور سودمند تھا۔ اس ذہنی روش نے قدرتی طور پر سرسید کو عقل پرست بنا دیا۔ انھوں نے عقلی نقطۂ نظر سے مذہب کی تعبیر و تفسیر کا بیڑا اٹھایا۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ یوں سیاسی فکر اور مذہبی تفسیر، دونوں اعتبار سے وہ مغرب کی ذہنی غلامی کا شکار ہو گئے۔ سرسید کا یہ رویہ ذہنی اعتبار سے مغرب کے سامنے completesurrender کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲)

مولانا محمد شبلی نعمانی، اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر علی گڈھ پہنچے تو ان کی عمر ۲۵ سال تھی۔ سرسید احمد خاں ۶۵ برس کے تھے۔ انھوں نے اس نووارد نوجوان سے وہی سلوک کیا، جو ایک شفیق باپ ایک عزیز بیٹے سے کرتا ہے۔ شروع میں وہ شہر میں رہتے تھے اور ان کی تنخواہ کا بڑا حصہ سواری کی نذر ہو جاتا تھا۔ سرسید نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطے میں مکان دیا۔ ایک وقت کے کھانے پر وہ عام طور پر شریک ہوتے تھے[۱۰]۔ روزانہ بلا ناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی[۱۱] "المامون" اسی دور کی تصنیف ہے۔ مولانا شبلی نے اس کے آغاز میں "فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج کے استنباط" کو "علم تاریخ کی جان اور روح" قرار دیا ہے۔ یہاں واضح طور پر وہ سرسید احمد خاں سے متاثر نظر آتے ہیں۔

سرسید احمد خاں کے ہاں مولانا شبلی کو ان کے نادر کتب خانے سے استفادے کا موقع ملا۔ یہ کتب خانہ یورپ، مصر، شام اور ترکی کی مطبوعہ ایسی نادر کتابوں پر مشتمل تھا جنھیں دیکھ کر "علم و فن کی ایک نئی دنیا ان کے سامنے نمودار ہوئی تو اس علم کے متوالے کی ساری کوفت جاتی رہی"[۱۲] اس دور کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نعمت غیر مترقبہ کے میسر آجانے سے، مولانا شبلی خود کو انتہائی خوش قسمت سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو حقیقت میں میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں۔ مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں۔ گبن صاحب کی تاریخ [Decline and fall of the Roman Empire]

جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے"[۱۳]

سرسید کے کتب خانے میں: "مولانا شبلی کو وہ کتابیں پڑھنے کو ملیں جن کا ابھی تک نام بھی نہ سنا تھا"[۱۴] ان کی شب و روز کی صحبت اور ان کے نادر کتب خانے سے استفادے نے مولانا شبلی کے مورخانہ رجحان کو جلا بخشی۔ سرسید کے ہاں انھیں: "وہ سامان تحقیق میسر آیا، جس نے ان کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے"[۱۵] بقول شیخ محمد اکرام: "سرسید نے شبلی کی اس علم کی طرف راہنمائی کی جو ان کا تاج فضیلت ہے یعنی علم تاریخ و سیرت نگاری"[۱۶] مولانا شبلی کا ذوق تاریخ بڑی حد تک سرسید کے فیضان و اثر کا نتیجہ ہے۔ ان کا حسب ذیل بیان ایک اعتبار[۱۷] سے اسی فیضان کا اعتراف ہے:۔

"ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں، جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمراں ہیں، لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو، بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں۔ بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔ بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا ہے۔ تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے ہیں"[۱۸]

سرسید احمد خاں کی وفات پر مولانا شبلی نے نواب سید علی حسن خاں کو لکھا:

تزعزعت ارکان الملۃ ...　　قومی عمارت کے ستون ہل گئے ....

وتفرق شملنا۔ انی لا اقدر　　ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔ میں کچھ

علی ان اشتغل بشیٔ الا بعد برہۃ　　دنوں تک کوئی کام نہیں کر سکتا۔

من الزمن[۱۹]

تاسف و تعزیت کا یہ انداز سرسید سے مولانا شبلی کے تعلق خاطر اور عقیدت مندی کو ظاہر کرتا ہے۔

(۳)

علی گڈھ تحریک کو ایک نظام شمسی مانا جائے تو سرسید احمد خاں، اس نظام میں سورج کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے تمام وابستگان تحریک کسب فیض کرتے اور مستنیر ہوتے نظر آتے ہیں۔ سرسید احمد خاں پر مغرب کا جو غیر معمولی اثر تھا وہ کم و بیش ان کے تمام رفقا پر بھی رہا۔ حالی ہوں یا ذکاء اللہ، چراغ علی ہوں یا محسن الملک، ذہنی مرعوبیت سے کوئی بھی خالی نہیں اور یہ مرعوبیت براہ راست یا بالواسطہ سرسید ہی کا فیضان ہے۔ علامہ شبلی جو سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور بقول ثمر: "ان کی فوج کے ایک نامی گرامی پہلوان"[19] سمجھے جاتے تھے، ان سب میں الگ نظر آتے ہیں، ابتدا میں وہ بھی انتہا پسند تھے ان پر حنفیت غالب تھی اور اس میں شدت بھی تھی۔ لیکن سرسید احمد خاں کی صحبت نے ان کے ذہن کو تبدیل کر دیا۔ وہ انتہا پسندی کی تنگنائے سے نکل آئے۔ مگر بہ ایں ہمہ قربت و کسب فیض اور مداحی و عقیدت مندی مولانا شبلی سرسید کی راہ نہیں اپنا سکے، سرسید کی مغرب پسندی انھیں پوری طرح اپنے رنگ میں رنگنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ سرسید کی طرح دوسری انتہا پر نہیں گئے بلکہ اپنے توازن فکر و نظر کی بدولت ایک معتدل ذہنی رویہ اختیار کر کے ایک علیحدہ راستہ نکالنے میں کامیاب ہوئے۔

مولانا شبلی مغرب کے علمی مذاق اور مختلف علوم میں یورپی مصنفین کی وسعت معلومات اور تحقیق میں مہارت کے قائل تھے۔ بلاشبہ مستشرقین نے اسلامی علوم و فنون سے متعلق سینکڑوں نادر مخطوطات کی بازیافت کی اور انھیں مدون کیا۔ بہت سی نایاب کتابیں تصحیح کر کے شایع کیں۔ اسلامی علوم پر انسائکلوپیڈیا اور لغات تیار کیے۔ مولانا شبلی اس باب میں یورپ کی مجموعی خدمات کے معترف ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں یورپ کی خوش مذاقی اور علمی فیاضیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں[20] مگر وہ ان کے غیر مشروط مداح نہیں ہیں۔ وہ ان کی کاوشوں کو "وحی و حدیث"

نہیں سمجھتے کیونکہ مغرب میں بھی متعصب علما کی ایک ایسی جماعت موجود رہی جس نے دانستہ کذب و افترا اور تاویل و تعصب سے کام لیا، یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں کیں[21]۔ اسی طرح بعض اوقات "یورپین مصنفین .... واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ نتیجہ ان کے موافق نکلتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ بہت سے ایسے راویوں سے استناد کرتے ہیں جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور و معروف ہیں لیکن دراصل ان کا کچھ اعتبار نہیں"[22]۔ اسی لیے مولانا شبلی انگریزی مصنفین کی "پردہ دری"[23] کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ تاہم مستشرقین اور ان کے علمی کارناموں کے بارے میں ان کا رویہ متوازن ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے بقول: "مولانا شبلی یورپ کے علوم و فنون کے مداح اور خوشہ چیں تھے، مگر اندھے مقلد نہ تھے"[24]

مولانا شبلی بنیادی طور پر قدیم نظام تعلیم کی پیداوار تھے، مگر ان کا طرز فکر قدامت کا اسیر نہیں ہے ان کے استاذ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی پر معقولات کا غلبہ تھا اور وہ جدید علوم کو تحقیر و تضحیک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ "مسدس حالی" کے جواب میں لکھی جانے والی "مسدس عوالی" سے مولانا چریاکوٹی کا متشددانہ اور قدامت پسندانہ رویہ واضح ہے۔ مولانا شبلی ان ہی مولانا چریاکوٹی کے لائق اور ہونہار شاگرد تھے ایسے شاگرد جن پر استاد کو بھی فخر تھا۔ مولانا کہا کرتے: اَنَا اَسَدٌ وَ اَنْتَ شِبْلِیْ[25] (میں شیر ہوں اور تو شیر کا بچہ) مولانا شبلی بھی معترف ہیں کہ: "میری تمام تر کائنات ان ہی کے افادات ہیں"[26] بہ ایں ہمہ مولانا اپنے استاد کی لکیر کے فقیر ثابت نہیں ہوئے، بلکہ اپنے اجتہادی ذہن کو بروئے کار لاتے ہوئے انھوں نے قدیم و جدید کے بارے میں ایک متوازن رویہ اختیار کیا۔

مولانا شبلی سرسید کے مداح تھے۔ انھوں نے سرسید کے "پرزور دست و قلم" ان کی "بہادری" ان کی "جانبازی" اور ان کی "انصاف پسندی" کا اعتراف کیا، مگر سرسید ہی کی تعلیم کردہ "اجتہاد اور تقلید سے آزادی" کے سبق کی روشنی میں وہ کسی "بڑے سے بڑے شخص یا نامور لیڈر یا ریفارمر" کی رائے کو اہمیت نہ دیتے تھے

کیونکہ ان کے بقول: "ہم (مسلمان) وہ لوگ ہیں جو پیغمبر کے سوا کسی کو معصوم نہیں سمجھتے"۔[27] انھیں سرسید کی جدیدیت اور تعلیم جدید کے بارے میں ان کا غلو کھٹکتا تھا۔ ان کے خیال میں جدید تعلیم انسان کو محض نوکری پیشہ بناتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"دنیا میں آئیڈیل (مطمح نظر) ایک چیز ہے جو انسان کے جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کرسکتی ہے؟ ہمارا آئیڈیل کیا ہے؟ ہم نے کس چیز کو تاکا ہے؟ ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ بی اے اور نوکریاں کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پرزور جذبات پیدا ہوسکتے ہیں؟ کیا اتنی سی بات کے لیے زحمتیں برداشت کی جاسکتی ہیں؟ کیا یہ مقصد کوئی بڑا ولولہ دل میں پیدا کرسکتا ہے؟"[28]

علی گڈھ کی ناکامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "ہماری قومی درسگاہوں نے آج تک ایثار نفس کی ایک مثال بھی نہیں پیدا کی"۔[29] اس کا سبب ان کے خیال میں یورپ کی تقلید محض تھی۔ علامہ ابن تیمیہ پر لکھتے ہوئے مولانا شبلی نے ایک جگہ طنزاً لکھا ہے کہ: "ہمارے زمانے میں تو زنار مرہونے کیلئے صرف یورپ کی تقلید کافی ہے"۔[30] بایں ہمہ جدید تعلیم کے بارے میں ان کی رائے محض یک رخی نہ تھی۔ وہ ایک خاص حد تک جدید تعلیم کی ضرورت اور افادیت کے قائل تھے۔ اسی لیے انھوں نے ندوہ کی تعلیم میں انگریزی یا یورپ کی کسی زبان کی لازمی تعلیم، "زمانۂ موجودہ کے علوم و فنون" کی تدریس "اور موجودہ زمانہ کی ضرورتوں اور خیالات سے واقفیت" ضروری سمجھی۔[31] مولانا شبلی کے نزدیک جدید تعلیم کا المیہ یہ تھا کہ وہ یک رخی تھی۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ سے ان کی یہ شکایت کچھ بے جا نہ تھی: ؎

نکتۂ شرع بہ افسانہ برابر بہ نہی — یورپ ار گپ زند آں نیز مسلم باشد
حل ہر مسئلۂ فقہ ز یورپ طلبی — شرع پیش تو ز تقویم کہن کم باشد
از ابوبکرؓ و عمرؓ ہیچ بہ یادت ناید — گرمی بزم تو از سیزر اعظم باشد
در سخن بگذرد از سیرت و شان بزنی — ہرچہ گوئی ہمہ از گفتۂ ولیم باشد[32]

علمی اور ذہنی و فکری سطح پر مغربیت کی مخالفت شاید اتنا مشکل کام نہ تھا، مگر سیاسی سطح پر انگریزوں کے استبداد کے خلاف آواز بلند کرنا ایک نازک مسئلہ تھا۔ اس سلسلے میں سرسید کی پالیسی تو وفاداری کی تھی، مگر مولانا شبلی اس راہ کو نہ اپنا سکے۔ انھوں نے نثر میں تو نہیں البتہ شاعری میں جہاں تہاں انگریزی استبداد اور حاکمانہ جبر و ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔[33] شہر آشوب اسلام، (ہنگامۂ طرابلس و بلقان) کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:۔

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو — یہ ظلم آرائیاں تاکے، یہ حشر انگیزیاں کبتک
یہ جوش انگیزیِ طوفانِ بے داد و بلا تاکے — یہ لطف اندوزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے — ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کبتک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا — ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کبتک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کبتک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم — مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کبتک[34]

مولانا شبلی کی شاعری کا ذکر آیا تو یہ امر قابل ذکر ہے کہ انگریزوں کی زیادتیاں ہوں یا ہندوستانیوں کی بے اعتدالیاں یا سیاسی جماعتوں کی ناہمواریاں انھوں نے سب کو "نشانۂ طنز بنایا ہے۔ لیکن اس طور پر کہ طنز میں نادا جب نشتریت پیدا نہیں ہوئی، بلکہ شروع سے آخر تک ایک سنبھلی ہوئی کیفیت قائم رہی ہے"۔[35] شیخ محمد اکرام کے الفاظ میں: "شبلی ایک ذوجہتین ہستی تھے۔ انھوں نے صرف قدیم کی پاسداری نہیں کی بلکہ وہ جدید کی مفید باتوں سے بھی مستفید ہونے کی کوشش کرتے تھے"۔[36]

ایسی فضا میں جب بقول مولانا عبدالماجد دریابادی:

"عرش سے لے کر فرش تک، ذرے سے لے کر آفتاب تک، علم و عمل، معاشرت، اخلاق، عقائد کے دائرے میں کوئی شئے ایسی نہ تھی جو "صاحب" کے نام کا کلمہ نہ پڑھ رہی ہو۔ ساری

خاصی مرعوبیت سے معمور تھی۔ "دانش فرنگ، حکمت مغرب، عقلائے فرنگ، اقبال سرکار، دانایانِ مغرب وغیرہ خدا جانے کتنے فقرے وہ مرعوبیت کی یادگار علوم متعارفہ کی طرح بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے اور ہماری زبان و ادب کا گویا جزو ہو گئے ہیں۔"[۳۷]

مولانا شبلی نے کورانہ اور اندھی تقلید کے خلاف سخت احتجاج کیا علی گڑھ کو چھوڑنے کا باعث بھی یہی ہوا کہ وہ ہر بات میں انگریزوں کی تقلید کو ناپسند کرتے تھے[۳۸] بایں ہمہ ناپسندیدگی وہ کسی شدید ردعمل کا شکار نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنا ذہنی توازن برقرار رکھا۔

حالی کا یہ قول: "ہم کو اب محکوم بن کر رہنا ہے"[۳۹] سرسید ہی کی صدائے بازگشت ہے۔ مولانا شبلی سمجھتے تھے کہ ہم محکوم سے حاکم بھی بن سکتے ہیں: "تاریخ اسلام میں جھانکو، دیکھو، ہم میں کیسے کیسے حاکم گذرے ہیں۔"

سرسید تقلید کے زبردست مخالف اور اجتہاد کے داعی تھے مگر پیروی مغرب کے باب میں انھوں نے بالکل برعکس روش اپنائی۔ وہ سرتاپا مغرب کے مقلد ثابت ہوئے۔ مولانا شبلی نے ایسی اندھی تقلید سے اجتناب کیا۔ بقول خورشید الاسلام: "شبلی کی زندگی توازن کی تلاش میں صرف ہوئی"[۴۰] مولانا شبلی بھی مذہبی جوش، قومی حمیت اور ملت کی خیرخواہی میں سرسید سے کم نہ تھے، مگر قومی ترقی کے جوش میں انھوں نے ہوش کا دامن نہیں چھوڑا۔ انھوں نے سرسید کی عقلیت کو معتدل بنایا۔ سرسید نے جزوی تبدیلیوں کے ذریعے وقتی علاج کرنا چاہا اور مذہب کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے تعبیر و تاویل کے ذریعے تجدید قوم کا بیڑا اٹھایا۔ مگر مولانا شبلی ملی نشأۃ ثانیہ کے لیے علمی بنیادوں پر ایک انقلاب لانا چاہتے تھے۔ انھوں نے "جدید علوم کی مدد سے مذہب کی حفاظت" کا اصول قائم کیا۔ اور یوں ان کا مسلک تجدید قوم کے بجائے تجدید دین قرار پایا۔ شاعری میں علامہ اقبال نے اسی طریق کار سے روشنی حاصل کی اور نثری ادب میں مولانا ابوالکلام آزاد،[۴۱] مولانا سید

سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی ہیں اس معتدل عقلیت پسندی کے مسلک پر چلتے نظر آتے ہیں۔

حوالے و حواشی

[۱] قصائد و مثنویات فارسی (مرتبہ: غلام رسول مہر) مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۷ (حصہ مثنویات) [۲] عتیق صدیقی: "سرسید احمد خاں، ایک سیاسی مطالعہ"۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۱۹۷۷ء ص ۲۶ [۳] سرسید احمد خاں: "رسالہ خیرخواہان مسلمانان" ص ۱۱ "تاریخ سرکشی ضلع بجنور" دہلی ایڈیشن مرتبہ: شرافت حسین مرزا، ص ۷۵، ۷۶، بحوالہ عتیق صدیقی: کتاب مذکور ص ۱۴، ۳۰ [۴] مکتوبات سرسید (جلد اول) مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۷۶ء۔ ص ۳۶۴ [۵] الطاف حسین حالی "حیات جاوید"۔ ترقی اردو بیورو دہلی۔ ۱۹۸۲ء۔ ص ۱۵۴ [۶] مکتوبات سرسید (جلد اول) ص ۱۷ [۷] عتیق صدیقی: کتاب مذکور ص ۱۰۱ [۸] مجموعہ لکچرز و اسپیچز، ص ۳۰۶، بحوالہ: "سرسید، ایک سیاسی مطالعہ" ص ۴ [۹] "حیات شبلی"، مکتبہ عالیہ لاہور، [۱۹۸۷ء] [۱۰] شیخ محمد اکرام "یادگار شبلی"، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ ۱۹۷۱ء۔ ص ۹۷ [۱۱] عبدالحلیم شرر: "مضامین شرر" جلد سوم (حصہ اول) گیلانی بکڈپو لاہور۔ پاکستان ص ۲۵۹ [۱۲] شیخ محمد اکرام: کتاب مذکور ص ۸۲ [۱۳] "مکاتیب شبلی"، حصہ اول۔ مطبع معارف اعظم گڑھ۔ طبع دوم ۱۹۳۸ء۔ ص ۵۶-۵۷ [۱۴] شیخ محمد اکرام: کتاب مذکور ص ۸۹ [۱۵] خلیق احمد نظامی: "سرسید اور علی گڑھ تحریک"۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ۱۹۸۲ء۔ ص ۲۴۹ [۱۶] شیخ محمد اکرام کتاب مذکور ص ۸۹ [۱۷] "مقالات شبلی"، جلد دوم۔ مطبع معارف اعظم گڑھ طبع دوم۔ ۱۹۵۰ء ص ۷، ۵ [۱۸] مکاتیب شبلی۔ حصہ دوم۔ مطبع معارف اعظم گڑھ۔ طبع دوم ۱۹۲۷ء۔ ص ۲۶۱ [۱۹] عبدالحلیم شرر: "مضامین شرر"۔ جلد سوم (حصہ اول) ص ۲۶۱ [۲۰] مولانا شبلی نعمانی: "مقالات شبلی۔ جلد چہارم مطبع معارف اعظم گڑھ۔ طبع سوم ۱۹۵۶ء ص ۱، ۲۹ جلد ہشتم، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۰ء ص ۱۳۴ وغیرہ [۲۱] مولانا شبلی نعمانی: "مقالات شبلی" جلد ہشتم ص ۳۳ [۲۲] علامہ شبلی نے مستشرقین کی کوتاہیوں اور

یورپ کی تنگ نظری کی جانب بکثرت اشارے کیے ہیں۔ دیکھیے: "مقالات شبلی" جلد پنجم، مطبع معارف اعظم گڈھ طبع دوم ۱۹۵۵ء۔ صفحات ۳۵، ۹۲، ۱۰۳، ۱۱۱۔ جلد ہشتم ص ۳۵ وغیرہ [۲۳] "مقالات شبلی" جلد پنجم ص ۱۰۰ [۲۴] "سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری و فنی جائزہ"۔ مکتبہ کاروان لاہور ۱۹۶۰ء ص ۳۰۸ [۲۵] مولانا سید سلیمان ندوی: "حیات شبلی" ص ۱۵۰ [۲۶] "مقالات شبلی" جلد ہشتم ص ۲۰ [۲۷] کتاب مذکور ص ۱۵۶ [۲۸] کتاب مذکور، ص ۱۵۰ [۲۹] حوالۂ مذکور [۳۰] "مقالات شبلی" جلد پنجم ص ۶۲ [۳۱] "مقالات شبلی، جلد ہشتم صفحات ۶۸، ۸۶، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۴۲ [۳۲] بحوالہ "نظام الملک طوسی" (محمد عبد الرزاق کانپوری) نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۳ء ص ۲۰ [۳۳] ۱۸۹۲ء میں بحری جہاز کے ذریعے ترکی جاتے ہوئے مولانا شبلی کو اثنائے سفر انگریزوں کی حاکمانہ بدمزاجی کا تلخ تجربہ ہوا اور اس تجربے نے ان میں شدید ردعمل پیدا کیا۔ یہ دلچسپ قصہ خان بہادر ڈاکٹر شیخ عبداللہ نے روایت کیا ہے۔ وہ اس زمانے میں علی گڈھ میں طالب علم تھے۔ ان کا بیان ہے:

"مولانا جس کیبن میں سفر کر رہے تھے۔ اس میں ایک نیچے کا برتھ ان کو ملا تھا اور اس برتھ کے اوپر جو برتھ تھا اس میں ایک انگریز سوار تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ وہ شخص جب نیچے اترتا تھا تو مجھے ایک ٹھوکر لگا کر جاتا تھا۔ میں خون کے گھونٹ پی کر صبر کر لیتا تھا کیونکہ جہاز انگریزوں کا۔ ہندوستان انگریزوں کے بس میں۔ جہاز کے کل ملازمین انگریزوں کے ماتحت۔ اب میں لڑتا تو کس سے لڑتا۔ اس کے بعد فرمایا کہ جب میں قسطنطنیہ میں تھا تو میں نے ایک بازار میں اپنے برابر چلتا ہوا ایک انگریز دیکھا۔ میں قصد کر کے اس انگریز کے بالکل قریب چلا گیا اور کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگا۔ موقع پا کر اس کو ایک دھکا دیا تو وہ شخص گرتے گرتے بچ گیا اور میں آگے بڑھ گیا اور دل میں کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ نہ یہاں انگریزی حکومت ہے اور نہ انگریزی جہاز ہے۔ اس قوم کے ایک بدبخت آدمی کو دھکا دیا کہ کسی روز اسی طرح سے دھکا دے کر ہندوستان سے ان کو نکالیں گے۔" ("مقالات یوم شبلی"، مرتبہ: خان عبیداللہ خاں۔ ص ۱۶۵)

[۳۴] "کلیات شبلی" اردو۔ مطبع معارف اعظم گڈھ۔ ۱۹۴۰ء ص ۵۶، ۵۷ [۳۵] ڈاکٹر وزیر آغا: شبلی کی سیاسی نظمیں، شمولہ: "مقالات یوم شبلی" (مرتبہ: خان عبیداللہ خاں) اردو مرکز لاہور ۱۹۶۱ء ص ۱۲۶، ۱۲۷ [۳۶] "یادگار شبلی" ص ۱۲ [۳۷] عبدالماجد دریابادی: "اکبر نامہ"۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔ ۱۹۵۴ء ص ۹۷ [۳۸] معین الدین انصاری: "شبلی، مکاتیب کی روشنی میں"۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ ۱۹۶۷ء ص ۲۰، [۳۹] "حیات جاوید": ص ۱۷۱ [۴۰] خورشید الاسلام: "تنقیدیں" ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ ۱۹۷۰ء ص ۳۹ خیال رہے کہ خورشید الاسلام ان لوگوں میں سے ہیں جو مولانا شبلی کے باب میں شدید معاندانہ رویہ رکھتے ہیں چنانچہ وہ "شبلی کی زندگی توازن کی تلاش میں صرف ہوئی" کے بعد یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں: "یا یوں کہیے کہ تلف ہو گئی"۔ یہ تضاد ان کے پورے مضمون میں نمایاں ہے۔ شبلی کے اعتراف عظمت پر ان کی آمادگی مضمون میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ لیکن شبلی کی "مولویت" انھیں ہضم نہیں ہوتی اور وہ بار بار طنز و تشنیع پر اتر آتے ہیں۔ خورشید الاسلام کا یہ مضمون شبلی کے بارے میں نام نہاد ترقی پسند ذہن کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے [۴۱] ڈاکٹر عالم خوندمیری لکھتے ہیں: "شبلی کے ایک وارث ابوالکلام ہیں۔۔۔ ایک دوسرے وارث اقبال تھے" (بحوالہ: یادگار شبلی ص ۳۱)

حیات شبلی

یہ کتاب محض علامہ شبلی مرحوم کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ مولانا کے دور کے ہندوستان کی مذہبی، علمی، تعلیمی و اصلاحی تحریکوں اور قومی و ملی سرگرمیوں کی مفصل تاریخ ہے، شروع میں جدید علم کلام کی نوعیت، اہمیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے اس میں علی گڈھ اور سرسید احمد خاں مرحوم سے مولانا شبلی کے تعلق کا ذکر بھی ہے۔

مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم،

قیمت:۔ ۴۸ روپے۔

ہر اک ذرہ میں ہے شاید مکیں دل

(اقبال کی ایک رباعی قرآن کی روشنی میں)

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ پھلواری، پٹنہ

اس مضمون میں اس عنوان کے تحت اقبال کی درج ذیل رباعی کا تجزیہ مقصود ہے جس میں قرآن کی اس آیت: یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کی صرف ترجمانی ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ حمد و ثنا کے ساتھ خدا کی تسبیح کرتے رہنے کے نکتہ کو حکیمانہ انداز میں ذہن نشین کرایا گیا ہے:۔

ہر اک ذرہ میں ہے شاید مکیں دل — اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل
اسیر دوش و فردا ہے ولیکن — غلام گردش دوراں نہیں دل
(بال جبریل)

اس رباعی میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ کائنات کے ہر ذرہ میں عشق جلوہ فرما ہے اور ہر شئے زبان حال سے معشوقِ حقیقی کے وجود پر شہادت دے رہی ہے اگرچہ یہ ذرہ دل کی خلوت میں نہاں ہے مگر بظاہر جلوت میں ہے یعنی لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اپنے کلام میں "دل" کو اتنی اہمیت دینے کی وجہ اقبال کے یہاں صرف اس لیے ہے کہ دل کا تعلق براہِ راست ایمان سے ہے جو انسان کی زندگی اور اس کے شعار کا جزو کل ہے۔ ایمان اور دل کے تعلق پر قرآن میں ارشاد ہے:۔

"مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو دل سے مانیں (سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۹) جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر) مگر جس نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کر لیا، اس پر اللہ کا غضب

اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے..... یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ یہ غفلت میں ڈوب چکے ہیں۔ ضرور ہے کہ آخرت میں یہی خسارے میں رہیں" (سورۃ النحل ۱۶۔ رکوع ۱۴)

اس رباعی کے دوسرے شعر میں اقبال نے جذبۂ عشق کو "اسیر دوش و فردا" بتایا ہے مگر یہ نکتہ بھی ذہن نشین کرایا ہے کہ یہ "جذبۂ عشق" جو اصل خویش ہے "غلام گردش دوراں نہیں" ہے یعنی کوئی شخص اگر اپنی عقل کے بجائے عشق کا اتباع کرے تو وہ اس "گردش دوراں" سے آزاد ہو سکتا ہے۔ انسان کو توجہ اس پر دینی چاہیئے زندگی کا مقصد کیا ہے۔ زماں یا زمانہ تو ہماری حیات ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ زمانہ ہی کی ایک شان ہے اور زمانہ کا خود وجود زندگی ہی سے وابستہ ہے۔ چنانچہ اقبال نے اپنے فارسی مجموعۂ کلام "اسرار خودی" میں زمان و مکان کے اس قرآنی تصور کو ایک حدیث کے حوالہ سے اس طرح ذہن نشیں کرایا ہے ؎

زندگی دہر است و دہر از زندگی است — لَا تَسُبُّوا الدَّھْرَ فرمان نبیؐ است

الغرض زمانہ موقوف ہے حیات انسانی پر اور حیات منحصر ہے ذات باری کے فیضان یا اس کی صفت ربوبیت کی تجلی پر۔ یہ دنیا اور اس کے مظاہر یعنی زمان و مکان سب ظلی وجود رکھتے ہیں۔ یہ سب اس کے سہارے ہی سے موجود ہیں۔ ان کا وجود حقیقی یا خانہ زاد نہیں ہے۔ چنانچہ "ضرب کلیم" کی نظم "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" میں اقبال کہتے ہیں ؎

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری — نہ ہے زماں نہ مکاں! لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ!

یہ کہ یہ "جذبۂ عشق" جو انسان کو بظاہر زمان و مکان اور دوش و فردا میں اسیر نظر آتا ہے لیکن اگر وہ اپنی خودی کو عشق رسولؐ میں ڈبو کر اللہ کے رنگ میں رنگ لے (صِبْغَةَ اللّٰهِ) تو اس کا یہ جذبۂ عشق اس "گردش دوراں" کی غلامی سے آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی نکتہ کو اقبال نے "بانگ درا" کی نظم "دل" کے اس آخری شعر میں اس طرح ذہن نشین کرایا ہے ؎

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے　　برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

اقبال نے اس رباعی میں خدا کی پاکی بیان کرتے رہنے کو بلا واسطہ ایمان کا اصل الاصول قرار دیا ہے کیونکہ ایمان کا یہی جزو شرک کی تردید کرتا ہے۔ اس لیے کہ شرک کا ہر عقیدہ اپنی حقیقت میں اللہ تعالیٰ پر کسی نہ کسی کمزوری اور عیب کا الزام لگاتا رہا ہے۔ اللہ کی تسبیح سے مراد ان تمام عیوب اور نقائص اور کمزوریوں سے جو مشرکین اپنے شرک اور انکار سے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اس ذاتِ بے ہمتا کے پاک اور منزہ ہونے کا اعلان و اظہار ہے۔ اس تردید پر قرآن میں بار بار آیت شریفہ مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے وارد ہوئی ہیں ان میں سے چند نفس مضمون کو ملحوظ رکھ کر، ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ اس رباعی کا پہلا شعر درج ذیل آیات کا ترجمان ہے:

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں؟ (اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ) ہر ایک اپنی نماز و تسبیح کا طریقہ جانتا ہے اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے (سورۃ النور ۲۴۔ آیت ۴۱) اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان اور زمین میں ہیں (تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْھِنَّ) کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو (وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ) مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بردبار اور درگزر کرنے والا ہے (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۴۴) وہ تو اللہ ہی ہے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سجدہ کر رہی ہے (وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا) اور سب چیزوں کے سائے صبح و شام اس کے آگے جھکتے ہیں (السجدۃ (سورۃ الرعد ۱۳۔ آیت ۱۵) اور کیا یہ لوگ

اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے دائیں اور بائیں گرتا ہے؟ سب کے سب اس طرح اظہارِ عجز کر رہے ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جس قدر جاندار مخلوقات ہیں اور جتنے ملائکہ ہیں سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔ (وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ) وہ ہرگز سرکشی نہیں کرتے (وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ) اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اسی کے مطابق کام کرتے ہیں (السجدۃ) (سورۃ النحل ۱۶۔ رکوع ۶) اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے۔ (یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ) بادشاہ ہے نہایت مقدس، زبردست اور حکیم (سورۃ الجمعہ ۶۲۔ آیت ۱)

متذکرہ بالا آیات میں لفظ "یُسَبِّحُ" صیغۂ مضارع میں وارد ہوا ہے جس میں حال اور مستقبل دونوں کا مفہوم شامل ہے۔ اور جس کے معنی یہ ہوے کہ کائنات کا ہر ذرہ اپنے پورے وجود سے ہمیشہ اپنے خالق اور رب کی پاکی بیان کرتا ہے، آج بھی کر رہا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا اور اس حقیقت پر زبان قال اور زبان حال سے گواہی دے رہا ہے اور دیتا رہے گا کہ جس نے اس کو پیدا کیا ہے اور جو اس کی پروردگاری اور نگہبانی کر رہا ہے اس کی ذات ہر عیب و نقص اور کمزوریوں سے منزہ ہے اور وہ اس سے بالکل پاک ہے کہ خدائی میں کوئی اس کا شریک و سہیم ہو۔ حتیٰ کہ بادلوں کی گرج بھی اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے۔ صیغۂ مضارع میں یہاں بھی فرمایا گیا کہ:-

"بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے (وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ) اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں (وَالْمَلٰٓئِکَۃُ مِنْ خِیْفَتِہٖ)

(سورۃ الرعد ۱۳۔ رکوع ۲)

حمد کے ساتھ تسبیح کرنے کی تاکید سورۃ النصر ۱۱۰ کی آیت ۳ میں بھی وارد ہوئی ہے۔ فرمایا:-

"تم اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو (فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ) اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو۔ بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے"

حمد سے مراد اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا کرنا بھی ہے اور اس کا شکر ادا کرنا بھی اور تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے پاک اور منزہ قرار دینا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ ہر شئے زمانۂ حال میں اس حقیقت کا اظہار کر رہی ہے کہ خدا کی ذات، صفات، افعال اور اس کے احکام خواہ وہ تکوینی احکام ہوں یا شرعی سراسر پاک ہیں بلکہ روز ازل سے ماضی میں بھی کائنات کا ذرہ ذرہ اسی حقیقت کا اعلان کرتا آیا ہے۔ قرآن میں جہاں صیغۂ ماضی استعمال ہوا ہے وہاں لفظ "سَبَّحَ" استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

"اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے (سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) اور وہی زبردست اور دانا ہے (سورۃ الحدید ۵۷۔ آیت ۱) اللہ ہی کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو آسمان اور زمین میں ہے (سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ) اور وہی غالب اور حکیم ہے (سورۃ الحشر ۵۹۔ آیت ۱) اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے (سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ) اور وہ غالب اور حکیم ہے (سورۃ الصف ۶۱۔ آیت ۱)

ماضی کے واقعات میں حضرت داؤدؑ کے سلسلہ میں قرآن میں ارشاد ہے کہ:۔

"داؤدؑ کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے، اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے (سورۃ الانبیاء ۲۱۔ آیت ۷۹) ہم نے داؤدؑ کو اپنے ہاں سے بڑا فضل عطا کیا تھا (ہم نے حکم دیا کہ) اے پہاڑو، اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو (اور یہی حکم ہم نے) پرندوں کو دیا۔ (سورۃ سبا ۳۴۔ آیت ۱۰)

حضرت داؤدؑ جب اللہ کی حمد و ثنا کے گیت گاتے تھے تو ان کی بلند اور سریلی آواز سے پہاڑ گونج اٹھتے تھے، پرندے ٹھہر جاتے تھے اور ایک سماں بندھ جاتا تھا اور یہی ہے لحن داؤدیؑ جو اردو زبان میں خوش الحانی سے نغمہ سرائی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اس خوش الحانی کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ذکر آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، جو غیر معمولی طور پر خوش آواز بزرگ تھے، قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے تو ان کی آواز سن کر کھڑے ہو گئے اور دیر تک سنتے رہے۔ جب وہ ختم کر چکے تو آپؐ نے فرمایا: اس شخص کو داؤدؑ کی خوش آوازی کا ایک حصہ ملا ہے"۔

خدا نے اپنی تسبیح کیے جانے کی اہمیت کو تمثیلی پیرایۂ بیان میں بلا واسطہ انسانوں کو اس طرح ذہن نشین کرایا ہے۔ فرمایا:۔

"زمین اور آسمانوں میں جو مخلوق بھی ہے اللہ کی ہے اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں (وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ) اور نہ ملول ہوتے ہیں (وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ) شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں (يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ) دم نہیں لیتے (لَا يَفْتُرُوْنَ)

(سورۃ الانبیاء ۲۱۔ رکوع ۲)

ان آیات میں یہ نکتہ ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ خدا کی تسبیح سے مراد اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر خدا کی بندگی سے سرتابی ہی نہ کرنا بلکہ ملول نہ ہونا یعنی بادلِ ناخواستہ اس کی بندگی نہیں کرنا ہے دوسرے یہ کہ جس طرح فرشتے تسبیح کرتے رہتے ہیں" دم نہیں لیتے (لَا يَفْتُرُوْنَ)" اسی طرح انسانوں کو بھی خدا کی تسبیح کرنے میں ناگواری نہ ہونی چاہیے کیونکہ ان کا وجود خدا ہی کی وجہ سے ہے خدا کی تسبیح کرتے رہنے کے معاملہ میں ملائکہ کے طرز عمل کی پیروی کرنے کی تاکید ایک اور موقع پر اس طرح

بھی فرمائی گئی ہے کہ :-

"جو فرشتے تمھارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں" السجدة (سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۲۰۶)

۲۔ اللہ کی پاکی بیان کرنے کے لیے تو کسی وقت کی پابندی کا سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ یہ عقیدہ تو ہر مومن کو ہر وقت رکھنا چاہیے کہ اگر محض زبان سے اللہ کی پاکی کا اظہار مقصود ہو تا تب بھی کسی وقت کی تخصیص کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی اوقات کی پابندی کے ساتھ تسبیح کرنے کا حکم عملی صورت میں نماز کی شکل میں قرآن کی مختلف سورتوں میں وارد ہوا ہے اور جس مقام پر بھی قرآن میں حمد و تسبیح کو خاص اوقات کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اس سے مراد نماز ہی ہے۔ ذکر بعد الصلوٰۃ کی متعدد صورتیں رسول اللہ صلعم سے منقول ہیں جن میں صحابۂ کرامؓ کو حضورؐ نے تسبیح کی تاکید کی اور تعلیم بھی دی مگر تسبیح مسنونہ میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ذکر سے اصل مقصود چند مخصوص الفاظ کو زبان سے گذار دینا نہیں ہے بلکہ ان معانی کو ذہن میں تازہ اور مستحکم کرنا ہے جو ان الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے جو ذکر بھی کیا جائے اس کے معنی اچھی طرح سمجھ لینے چاہئیں اور پھر معنی کے استحضار کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ غریب مہاجرینؓ نے حاضر ہو کر عرض کیا: "یا رسول اللہؐ، مالدار لوگ تو بڑے درجے لوٹ لے گئے"۔ حضورؐ نے فرمایا: "کیا ہوا؟" انھوں نے عرض کیا: "وہ بھی نمازیں پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں، مگر وہ صدقہ کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے"۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: "کیا میں تمھیں ایسی چیز بتاؤں جسے اگر تم کرو تو تم دوسرے لوگوں سے

بازی لے جاؤ گے بجز ان کے جو وہی عمل کریں جو تم کرو گے؟ وہ عمل یہ ہے کہ تم ہر نماز کے بعد ۳۳-۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کہا کرو"۔ کچھ مدت کے بعد ان لوگوں نے عرض کیا کہ: "ہمارے مالدار بھائیوں نے بھی یہ بات سن لی ہے اور وہ بھی یہی عمل کرنے لگے ہیں"۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: "ذٰلِكَ فضل اللہ یؤتیہ من یشآء۔" بعض روایتوں میں اللہ اکبر ۳۴ بار کہنا منقول ہے۔

عقیدۂ توحید کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک مومن اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہر وقت خدائے برتر و بزرگ کی تقدیس و تسبیح کو نہ بھولے۔ مثال کے طور پر سواریوں پر بیٹھتے وقت بھی تاکید فرمائی گئی ہے کہ :-

"جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ: "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں (کشتیوں اور جانوروں کی سواری) کو مسخر کر دیا (سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا) ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"۔ (سورۃ الزخرف ۴۳۔ رکوع ۱)

دوسرے موقع پر ارشاد ہے :-

(اے نبیؐ) تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو (وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ حِیۡنَ تَقُوۡمُ) رات کو بھی اس کی تسبیح کرو اور ستارے جب پلٹتے ہیں اس وقت بھی" (سورۃ الطور ۵۲۔ رکوع ۲)

اس آیت کے الفاظ "جب تم اٹھو" سے مفسرین نے رسول اللہ صلعم کی زندگی سے بہت سے مفہوم لیے ہیں۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ جب بھی تم کسی مجلس سے اٹھو تو اللہ کی حمد و تسبیح کر کے اٹھو۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب تم نیند سے بیدار ہو کر اپنے بستر سے اٹھو تو اپنے رب کی تسبیح کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اللہ کی حمد و تسبیح سے اس کا آغاز کرو۔ اسی حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلعم نے یہ ہدایت فرمائی کہ نماز کی ابتدا تکبیر تحریمہ کے بعد ان الفاظ سے کی جائے : سبحانک اللّٰھم وبحمدک وتبارک اسمک

وتعالیٰ جدک ولا الٰہ غیرک"۔ چوتھا مفہوم یہ ہے کہ جب تم اللہ کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھو تو اللہ کی حمد و تسبیح سے اس کا آغاز کرو۔ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید فرمائی گئی کہ:۔

"فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (پس اے نبیؐ، اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو"

(سورۃ الواقعہ ۵۶۔ آیت ۷۴)

اور پھر اسی سورۃ کی آخری آیت ۹۶ میں یہی تاکید دہرائی گئی ہے کہ:۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (پس اے نبیؐ، اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو"

حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ اس کو تم لوگ اپنے رکوع میں رکھ دو۔ یعنی رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ کہا کرو۔ اور جب سورۃ الاعلیٰ ۸۷ کی درج ذیل پہلی آیت نازل ہوئی کہ:۔

"سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (اے نبیؐ، اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو"

تو حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ ہی کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اسے اپنے سجدے میں رکھو یعنی سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى کہا کرو۔ (مسند احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم) اقبال نے سورۃ الاعلیٰ ۸۷ کی مندرجہ بالا آیت کی تلمیح "ضرب کلیم" کی نظم "ذکر و فکر" میں اس طرح کی ہے ؎

مقامِ ذکر ہے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى   مقام فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں

"سبحان اللہ بھی تسبیح ہی ہے جس میں ایک پہلو تعجب کا بھی ہے۔ جب کوئی محیر العقول واقعہ پیش آتا ہے تو آدمی سبحان اللہ کہتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی قدرت سے ایسا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ہے۔ سورۃ النمل ۲۷ کی آیت ۸ میں مذکور ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچے تو ندا آئی کہ: "سُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (پاک ہے اللہ، سب جہان والوں کا پروردگار)" اس میں تعجب کا پہلو یہ ہے کہ نورِ مطلق اپنی تمام محدودیتوں سے پاک اور

منزہ ہوتے ہوئے بذاتِ خود تم سے مخاطب ہے۔ کبھی اس کلمہ "سبحان اللہ" سے اظہارِ تعجب اور واقعی دونوں معنی مراد ہوتے ہیں جیسے سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۶۸ میں ارشاد ہے:۔

"لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ سبحان اللہ (سُبْحَانَهُ) وہ تو بے نیاز ہے"

۳۔ اب تک باتیں اقبال کی زیر تجزیہ رباعی کے پہلے شعر پر کی جا رہی تھیں۔ اس رباعی کے دوسرے شعر کو درج ذیل آیات کی روشنی میں پڑھا جا سکتا ہے جس میں خدا نے خود فرمایا ہے کہ عشقِ الٰہی میں گرویدگی ایمان رکھنے والوں کے دلوں میں "گردشِ دوراں" کے باوجود ہر آن جاری و ساری رہتی ہے۔ ارشاد ہے:۔

"(اس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں جنھیں بلند کرنے کا اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے۔ ان میں ایسے لوگ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامتِ نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی (سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۵) اے لوگو جو ایمان لائے جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو" (سورۃ الجمعہ ۶۲۔ آیت ۹)

اقبال کامل

اس کتاب میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے اور انکی شاعری کے اہم موضوعات فلسفۂ خودی، فلسفۂ بے خودی، نظریات تعلیم سیاست، صنف لطیف، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔

مرتبہ مولانا عبد السلام ندویؒ مرحوم (صاحب شعر الہند)

صفحات: ۴۰۰ قیمت: ۲۸۔۰۰

رام پور کے قدیم عربی مدارس

از

جناب محمد شعائر اللہ خاں صاحب ریسرچ فیلو خدابخش لائبریری پٹنہ

"اپریل ۱۹۸۸ء کے معارف میں مدرسہ عالیہ رام پور پر مضمون نگار کا جو مقالہ شایع ہوا تھا اسے بعض اہل علم نے پسند کیا، اب انھوں نے رام پور کے دوسرے قدیم عربی مدارس کا حال بھی قلمبند کیا ہے، توقع ہے کہ اسے بھی علمی حلقوں میں پسند کیا جائے گا" (معارف)

مدرسہ غوثیہ یہ مدرسہ عہد نواب خلد آشیاں (کلب علی خاں - ۱۸۶۵-۱۸۸۷) میں قائم ہوا تھا جب کہ ان کی مسند نشینی کو تخمیناً ڈیڑھ سال گذرا ہوگا اس کی بناء کا حال درج ذیل اقتباس سے معلوم ہوگا۔

"زمانہ ولی عہدی میں خلد آشیان نذر حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ہر مہینے میں کیا کرتے تھے جب مسند نشین ہوئے تب یہ حکم نافذ فرمایا کہ مقدار زر نذر ہر مہینے میں زیادہ کیا جائے چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں اس مقدار زر نذر نے اس قدر ترقی پائی کہ اسی میں صرف مدرسہ غوثیہ قرار دیا گیا اور کچھ مساکین وزنان بیوہ کی تنخواہیں مقرر کی گئیں وجہ تسمیہ بھی اس مدرسہ کی یہی ہے۔ اس مدرسہ میں فی الحال ۲ مدرس حافظ قرآن شریف ہیں اور قریب ستر طلبہ کے تعلیم پاتے ہیں جن میں سے قریب قریب ۳۵ طلبہ کو سرکار کی طرف سے ایک روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا ہے۔

پہلے اس مدرسہ میں صرف کلام مجید حفظ کرایا جاتا تھا مگر یکم اپریل ۱۸۸۹ء سے

اردو کی کتب دینی بھی پڑھائی جاتی ہیں اور خوش نویسی سکھائی جاتی ہے[1]

مدرسہ غوثیہ کا قیام رام پور کی موتی مسجد (جس کا تاریخی نام خانہ خدا ہے ۱۲۶۱ھ) میں ۱۸۶۷ء / ۱۲۸۳ھ میں ہوا۔ سید نذر الحسن رقمطراز ہیں:

"موتی مسجد میں تدریس کے لیے ۲ کمرے تھے جن میں ۲ حفاظ طلبہ کو قرآن کریم کی تعلیم دیتے تھے اور اتفاق سے ہر استاد کو ۸ روپیہ ماہوار ہی ملا کرتے تھے البتہ جمعدار کو ۱۰ روپے ملا کرتے تھے[3]

منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی نے اس مدرسہ کی تعریف میں یہ اشعار کہے ہیں ؎

یہاں مدرسے دو جو مدت سے ہیں — مصارف مقرر ریاست سے ہیں
زبس عالیہ غوثیہ نام ہے — مدرس ہے جو اہل اسلام ہے
یہی علم پڑھتے ہیں ارباب دیں — سوا اس کے کچھ اور چرچا نہیں
فراغت سے مصروف تحصیل ہیں — شب و روز مشغول تکمیل ہیں
مسافر سمجھ کر خدا کے لیے — وظیفے ہر اک کے مقرر کیے[4]

موتی مسجد سے مدرسہ غوثیہ کی منتقلی کی متعین تاریخ نہیں معلوم ہو سکی لیکن مولانا عبد السلام خاں صاحب سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور کے خیال کے مطابق "جنرل اعظم الدین خاں کے دور میں اسے جب مدرسہ عالیہ کے ساتھ منسلک کیا گیا اسی وقت اس کی جگہ بھی تبدیل ہوئی اور بظاہر جہاں جہاں مدرسہ عالیہ منتقل ہوا وہاں وہاں یہ بھی منتقل ہوا۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں جب مدرسہ

۱؎ رپورٹ انتظامیہ ریاست رام پور بابت سال ۸۹-۱۸۸۸ء صفحہ ۳۸۶ ۲؎ آثار منصور مرتبہ سید نذر الحسن قادری۔ ناظم پریس رام پور، ۱۹۷۴ء صفحہ ۱۸ ۳؎ ارشادات عالیہ قلمی جلد دوم از وجیہ الدین احمد خاں صفحہ ۲۶ مملوکہ راقم الحروف ۴؎ تواریخ کامل قلمی مرتبہ امیر اللہ تسلیم صفحہ ۵۷ موجود رضا لائبریری رامپور مخطوطات نمبر ۱۱۹۰

عالیہ گنج قدیم کی عمارت میں منتقل ہوا تو یہ بھی اس کے سامنے والی عمارت میں رہا۔ یہ عمارت بہت وسیع تھی جس میں چار رویہ کمرے بنے ہوئے تھے لیکن افسوس ہے کہ مرمت اور دیکھ بھال نہ ہونے کی بنا پر اب یہ شکستہ ہوگئی ہے اسی لیے ۱۹۸۲ء میں مدرسہ غوثیہ کو کلب گھر کے نچلے حصہ میں منتقل کردیا گیا جہاں آج کل مدرسہ عالیہ موجود ہے۔ مندرجۂ ذیل بیان سے مدرسہ کی مالی حالت کا اندازہ ہوگا۔

"نواب کلب علی خاں کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ انھوں نے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ایصال ثواب کے لیے ایک وقف کیا تھا جس کا مصرف انھوں نے تعلیم قرآن مقرر کیا تھا۔ چنانچہ مدرسہ غوثیہ کے سارے مصارف مع وظائف طلبہ اسی وقف سے ہوتے تھے اساتذہ اور طلبہ کی نشست کا انتظام موتی مسجد میں کیا گیا تھا جس کو نواب یوسف علی خاں صاحب نے جامع مسجد کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ بعد کو جنرل عظیم الدین (خاں) نے اپنی مدارالمہامی کے زمانہ (میں) اس کو مدرسہ عالیہ میں شامل کردیا۔ آخر میں وقف اور اس کی خاص آمدنی بھی ریاست کے عام میزانیے (Budget) میں شامل ہوگئی۔ وظائف طلبہ تو مسدود ہوگئے اور مدرسہ عالیہ کی طرح یہ بھی اپنی حیات کی آخری سانس لے رہا ہے۔[1]

اس مدرسہ میں تعلیم کے دو شعبے رہے (۱) حفظ قرآن (۲) اردو فارسی عربی اور حساب۔ تلاش وجستجو کے بعد مندرجۂ ذیل اساتذہ کے نام معلوم ہوسکے ہیں۔

نام مدرس	عہدہ	کیفیت
(۱) حافظ خلاق دہلوی[2]	قاری و مدرس اعلیٰ	عہد کلب علی خاں سے حامد علی خاں تک

[1] رام پور کے اوقاف قلمی از عبدالسلام خاں، سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور (کتبخانہ جامع العلوم فرقانیہ رامپور نمبر ۲۱۲) [2] ضمیمہ حقیقت رامپور مرتبہ اکرام عالم بدایونی۔ نظامی پریس بدایوں۔ ۱۹۲۰ء صفحہ ۸

نام مدرس	عہدہ	کیفیت
(۲) حافظ احمد علی[1]	مدرس حفظ	۲ جنوری ۱۸۹۰ کو مدرسہ عالیہ میں تقرر ہوا بعد کو غوثیہ میں تبادلہ ہوگیا۔
(۳) حافظ علی بہادر خاں[2]	افسر مدرس	۱۸۹۴ میں اضافۂ تنخواہ میں نام آیا ہے
(۴) مولوی افضال الحق ولد مولوی فضل حق رامپوری[3]	مدرس فارسی	۷ فروری ۱۹۱۱ کو تقرر ہوا۔ ۱ مارچ ۱۹۱۲ کو مدرسہ عالیہ میں منتقل ہوگئے۔
(۵) حافظ عظیم اللہ خاں[4]	مدرس دوم	۱۹۱۲ میں اضافۂ تنخواہ میں نام آیا ہے
(۶) حافظ عبدالستار ولد عبدالرزاق[5]	مدرس حفظ	۵ فروری ۱۹۲۵ء کو تقرر ہوا۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ریٹائر ہوئے۔
(۷) مولوی عبدالجلیل مجددی[6]	مدرس اردو، حساب	۱۰ جون ۱۹۳۵ کو تقرر ہوا۔ ۳۰ جون ۱۹۶۸ کو ریٹائر ہوئے۔
(۸) قاری ضیاء الدین افروز[7]	مدرس حفظ	یکم اکتوبر ۱۹۵۳ کو تقرر ہوا۔ ۳۰ جون ۱۹۷۶ کو ریٹائر ہوئے۔
(۹) حافظ فضل الرحمٰن خاں[8]	مدرس حفظ	یکم اکتوبر ۱۹۵۳ کو تقرر ہوا۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۶۹ کو ریٹائر ہوئے۔
(۱۰) قاری محمد راشد مجددی[9]	قاری انچارج مدرسہ	۷ ستمبر ۱۹۶۵ سے یہ اس عہدہ پر فائز ہیں

[1] رام پور گزٹ جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۳ ۱۸۹۰ء [2] ایضاً جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۳۹ ۱۸۹۴ء [3] فہرست ملازمین ۱۹۰۴ء [4] رام پور گزٹ جلد ۲۴ شمارہ نمبر ۱۷ ۱۹۱۲ء [5] تا [9] سروس بکس۔

نام مدرس	عہدہ	کیفیت
(۱۱) حافظ فراغ احمد [1]	مدرس حفظ	—
(۱۲) حافظ قاسم علی خاں [2]	"	—
(۱۳) حافظ واجد علی [3]	"	—
(۱۴) حافظ عبد الحمید مجددی [4]	"	بعد ۱۹۴۵ء
(۱۵) حافظ وحید الرحمٰن مجددی [5]	"	—
(۱۶) حافظ عبد المجید مجددی [6]	"	—
(۱۷) حافظ مظفر حسین [7]	"	—
(۱۸) حافظ یوسف شمسی [8]	"	—
(۱۹) حافظ یٰسین احمد [9]	"	—
(۲۰) حافظ احمد نبی مرحوم [10]	"	—
(۲۱) حافظ احمد حسن [11]	"	—
(۲۲) حافظ شوکت علی [12]	"	۲۳ر دسمبر ۱۹۶۱ کو تقرر ہوا۔
(۲۳) حافظ خوشنود حسین خاں [13]	"	۱۱ر نومبر ۱۹۶۴ کو تقرر ہوا۔ ۱۲ر جون ۱۹۶۸ کو سبکدوش ہوئے۔
(۲۴) حافظ اخلاق حسین [14]	"	۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۰ کو تقرر ہوا۔

ارشاد العلوم | اسے دار الارشاد بھی کہا جاتا تھا[1] ابتدائی سالِ اجرا اس مدرسہ کا ۱۲۸۴ھ/

[1] تا [12] بقول قاری محمد راشد مجددی و مولوی ثناء اللہ خاں (خورد)
[13] تا [14] مدرس بکس۔

۱۸۶۷ء ہے جب کہ مولانا ارشاد حسین مجددی (م ۱۸۹۴ء) اس میں درس دیتے تھے اور سینکڑوں طلبہ اس مدرسہ سے فیض یاب ہوتے تھے"۔ لیکن مدرسہ کے قیام کا اصل سال ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء ہے[1]۔
"۱۰ر مارچ ۱۸۹۰ کو مولوی خواجہ احمد اس کے مہتمم بنائے گئے"[2]۔

یہ مدرسہ محلہ کھاری کنواں (چاہ شور) پر بر مکان مولوی ارشاد حسین مجددی قائم ہوا تھا، مولانا کی وفات ۱۸۹۴ء کے بعد اس کے نگراں شمس العلما مولانا ظہور الحسین مجددی (م ۱۹۲۴ء) ہوگئے۔ اس کے بعد مولوی معوان حسین مجددی کو تکمیل تعلیم کے بعد متولی اور مہتمم بنا دیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں وفات کے بعد مولانا ریحان حسین مجددی اس کے متولی و مہتمم ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ان کی بھی وفات ہوگئی تب ان کے صاحبزادے "مولوی اکرام حسین اس کے مہتمم و متولی ہوئے ۱۹۴۷ء میں اکرام صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد تولیت اور اہتمام کا کام مولوی سجاد حسین وکیل کے سپرد ہوگیا۔

لیکن سجاد میاں صاحب زیادہ دنوں اس بار کو نہ برداشت کر سکے اور ۱۹۴۹ء میں یہ مدرسہ ختم ہوگیا"[3]۔

۲۹ر جنوری ۱۹۳۵ء کو مدرسہ کے انتظام و انصرام کے لیے ایک جمعیۃ شوریٰ قائم ہوئی۔

اسی زمانہ میں مولوی نوشہ علی نوشہ نے مدرسہ کی مدح میں اشعار کہے تھے۔

خدا نے اپنی قدرت سے نئی صورت اتاری ہے	جو دیکھو چشم باطن سے تو یاں پر فیض جاری ہے
کتاب اللہ کی تفسیر احمدؐ سے یہ جاری ہے	نہیں تم مدرسہ سمجھو یہاں تعلیم حق کی ہے

[1] ہفتہ وار دبدبۂ سکندری رام پور مورخہ ۱۲ر اگست ۱۹۴۰ صفحہ ۲۳ [2] فہرست اساتذہ قدیم رام پور (موجودات دفتر مدرسہ عالیہ رام پور) [3] بقول میاں سجاد حسین مجددی خلف میاں احسان حسین مجددی مرحوم۔

یہاں پر ذکر ہوتا ہے حدیث نور کا بندو　　جو عارف ہو تو پہچانو کہ یہ ارشاد باری ہے

مرے ہادی نے دی ہم کو ہدایت شکل انساں میں　　یہ شان مجتہد میں نور کی صورت اتاری ہے

خدا کے حکم سے اچھی ہوئی تاثیر پانی میں　　مثال چاہِ زم زم آب بھی اس جا کا کھاری ہے

یہی آٹھوں پہر فریاد ہے نوشاہ کی یا حضرت　　بلالو قید سے مولا مجھے اب بے قراری ہے[1]

مدرسہ میں حفظ قرآن کے ساتھ عربی کی انتہائی تعلیم مع دورۂ حدیث ہوتی تھی یہاں کے تلامذہ میں علامہ شبلی نعمانی مولانا سلامت اللہ اور مولوی عبد الغفار خاں جیسے ممتاز لوگوں کے نام شامل ہیں اساتذہ کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱- حافظ مولوی محمد عنایت اللہ خاں قبل ۱۹۰۰ء[2] ۲- مولوی ہدایت اللہ خاں قبل ۱۹۰۰ء[3] ۳- مولوی عبد الرحیم بعد ۱۹۰۰ء[4] ۴- مولوی امانت اللہ خاں قبل ۱۹۰۰ء[5] ۵- مولوی عبد الحیٔ قبل ۱۹۰۰ء[6] ۶- مولوی شجاعت علی قبل ۱۹۰۰ء[7] ۷- مولوی پُر دل (سابق مدرس مدرسۂ ٹونک) قبل ۱۹۰۰ء[8] ۸- مولوی سید دیدار علی (ساکن الور- راجستھان) قبل ۱۹۰۲ء[9] ۹- مولوی ارشد علی (سابق مدرس مدرسۂ ٹونک) ۱۹۱۰ء میں مدرس تھے[10] ۱۰- مولوی سوان حسین مجددی قبل ۱۹۳۳ء[11] ۱۱- مولوی ریحان حسین مجددی قبل ۱۹۳۵ء[12]

---

[1] مملوکہ راقم الحروف [2] و [3] فلاح دارین از محمد علی خاں رام پوری مطبوعہ احمدی پریس رامپور ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء صفحہ ۱۳ [4] تقاریر رپورٹ مدرسہ ارشاد العلوم مطبوعہ احمدی پریس رامپور تقریباً ۱۹۰۰ء صفحہ ۶ [5] اعلام الاذکیا از مولوی سلامت اللہ رام پوری [6] مخزن تحقیق (تحفۂ حنفیہ پٹنہ) جلد ۶ شمارہ ۶ ماہ جمادی الآخر ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء صفحہ ۱۵ [10] احتراز الصالحین از عبد الحلیم قادری گلزار حسن پریس بمبئی ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء صفحہ ۳۱ [11] طرب الکرام از نور الحسین مجددی مطبوعہ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء صفحہ ۳۱ [12] تذکرۂ کاملانِ رامپور از احمد علی خاں شوق رام پوری مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۹ء صفحہ ۱۳۸۔

۱۲- مولوی قمر الدین ۱۹۱۳ء میں مدرس تھے[1] ۱۳- مولوی رشید الرحمٰن مجددی قبل ۱۹۳۸ء[2] ۱۴- مولوی نور الحسین فاروقی تقریباً ۱۹۴۰ء[3] ۱۵- حافظ اسد علی درجہ حفظ میں ۱۹۰۰ء سے قبل مدرس تھے[4]

مدرسہ انوار العلوم اس کی ابتدا ۱۸۹۰ء میں ہوئی۔ اس کے بانی مفتی محمد لطف اللہ ابن مفتی سعد اللہ مراد آبادی تھے۔

مفتی محمد لطف اللہ ۱۲۵۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے رام پور میں علوم کی تکمیل کی۔ جب والد مفتی سعد اللہ کا ۱۸۷۰ء میں انتقال ہوا تو "خلد آشیاں نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم (م ۱۸۸۷) نے انھیں قاضی و مفتی شہر اور حاکم مرافعہ بنا دیا تھا"[5] "موصوف نے ۱۸۹۰ میں بازار کلاں میں مدرسہ انوار العلوم کی بنیاد ڈالی"[6] اس مدرسہ کے بانی اراکین میں "حکیم احمد رضا خاں لکھنوی (م ۱۹۰۴ء) بھی تھے جنھوں نے بنائے مدرسہ میں کافی اعانت کی اور خاص دلچسپی سے کام کیا"[7]

مفتی صاحب "۸ جولائی ۱۸۹۹ء کو مدرسہ عالیہ کے پرنسپل ہو گئے تھے[8] اور ۲۹ اگست ۱۹۰۷ء تک اس عہدہ پر برقرار رہے"[9] اس کے بعد ان کو مفتی عدالت دیوان مقرر کیا گیا۔ اس

---

[1] فصل الخطاب فی مقتبی عبد الوہاب از ریاست علی خاں مطبوعہ یوسفی پریس لکھنؤ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء صفحہ ۳۲ [2] طرب الکرام بحوالۂ مذکورہ صفحہ ۳۱ [3] بحوالہ سید سجاد حسین وکیل سابق مہتمم مدرسہ [4] رپورٹ مدرسہ ارشاد العلوم بحوالۂ مذکورہ صفحہ ۶ [5] تذکرۂ کاملان رام پور بحوالۂ مذکورہ صفحہ ۲۳۹ [6] رپورٹ انتظامیہ ریاست رامپور بابت ۹۰-۱۸۸۹ء صفحہ ۱۲۱ [7] تذکرۂ خاندان عزیزی از حکیم ظل الرحمٰن مطبوعہ لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ ۱۹۷۸ء صفحہ ۱۹۷ [8] رام پور گزٹ جلد ۱۱ شمارہ ۲۹ ۱۸۹۹ء [9] رام پور گزٹ جلد ۱۸ شمارہ ۳۰ ۱۹۰۷ء۔

عہدہ پر انھوں نے نہایت نیک نفسی سے خدمت انجام دی۔ لوگ ان کے انصاف کے بڑے مداح تھے "مورخہ ۱۳ر مارچ ۱۹۱۳ء کو انتقال ہوا اور احاطۂ مزار سید عبداللہ شاہ بغدادی (م ۱۲۰۷ھ) میں دفن کیے گئے۔ صاحبزادوں میں فضل اللہ، شکر اللہ اور رحمت اللہ تھے۔"[1]

مفتی صاحب مدۃ العمر مدرسہ کی ساری ذمہ داریاں سنبھالے رہے ان کی وفات کے بعد "مدرسہ کے انتظام کے لیے انجمن انتظامیہ اور انجمن اشاعت العلوم قائم ہوگئی تھی اس کے سربراہ حافظ احمد علی خاں شوق تھے۔"[2] حافظ صاحب نے اپنے دور میں اس مدرسہ کو کافی استحکام پہنچایا اور وفات تک اس کی ترقی میں مصروف کار رہے۔ "۲۰ر دسمبر ۱۹۳۳ کو حافظ صاحب کا انتقال ہوا اور وہ محلہ جھنڈا پر مزار میاں محمد امیر شاہ صاحب (م ۱۲۹۰ھ) میں دفن کیے گئے۔"[3] تب اس کی کمیٹی کے سربراہ کپتان واجد علی خاں (م ۱۹۶۱ء) ہوگئے۔ حکیم احمد حسن عرصے سے ناظم تعلیم تھے ان کے بعد حکیم انوار الحسن کو تعلیم کا ناظم بنا دیا گیا۔"[4]

۱۹۴۰ء میں کپتان صاحب نے مدرسہ کی سربراہی مولوی محمد افضال الحق شمسی ولد فضل حق (ساکن پنجابیان) کے سپرد کر دی۔ مولوی صاحب موصوف نے مدرسہ کی طرف توجہ دینا شروع کی لیکن جب مشاغل اور کاروبار مدرسہ کے انتظام میں مانع ہوئے تب موصوف نے اس کی ساری ذمہ داری اور تولیت مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خاں کے سپرد کر دی جنھوں نے مدرسہ کی ایک کمیٹی تشکیل کی تھی۔

۱۹۷۱ء سے جامع العلوم فرقانیہ سے مدرسہ کا الحاق ہوا۔ اور مرکز کی جانب سے دارالاقامہ کے لیے تعمیرات شروع ہوئیں جو ۱۹۷۲ء سے شروع ہو کر ۱۹۷۵ تک جاری رہیں

---

[1] دبدبۂ سکندری مورخہ ۷ر اپریل ۱۹۱۳ء [2] ایضاً مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۱۵ء [3] ایضاً مورخہ یکم جنوری ۱۹۳۴ء [4] بقول مولوی افضال الحق صاحب شمسی (خورد)

تقریباً ایک لاکھ روپیے اس کی عمارت میں صرف ہوا اور بحمد اللہ اب یہ دو منزلہ پختہ و پُر عمارت ہے جس میں ایک ہال اور ۱۷ کمرے ہیں۔ ۴ کمروں میں تعلیم ہوتی ہے اور تیرہ کمرے طلبہ کی رہائش کے کام آتے ہیں۔ بقیہ کمرے اور کوٹھریاں مطبخ کی ضرورت کے لیے وقف ہیں۔

"مدرسہ کے تعلیمی و انتظامی اخراجات کمیٹی اپنی آمدنی سے پورا کرتی ہے جس کا بجٹ تقریباً دس ہزار روپیے سالانہ ہے۔ دارالاقامہ کے اخراجات جامع العلوم فرقانیہ کے بجٹ سے پورے کیے جاتے ہیں یہ اخراجات تخمیناً پچاس ہزار روپیے سالانہ ہیں۔"[1]

اس مدرسہ کی کچھ دکانیں اور گودام وغیرہ بھی ہیں جس سے چار ہزار روپیے سالانہ کی آمدنی ہے بقیہ اخراجات عطیات سے پورے کیے جاتے ہیں۔

مدرسہ میں ابتدائی عربی اور حفظ و تجوید کے تین درجات قائم ہیں اس کے علاوہ ایک درجہ فارسی کی مکمل تعلیم کا ہے جس میں جامعہ اردو کے امتحانات کی تیاری بھی کرائی جاتی ہے۔

مدرسہ عاشقیہ | یہ مدرسہ سنہ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ محلہ بلاسپور گیٹ پر مسجد میاں خواجہ احمد میں قائم ہوا تھا اس کے بانی میاں خواجہ احمد (م ۱۹۳۴) تھے انھوں نے اپنے والد میاں محمد عاشق (م ۱۸۹۳) کے نام نامی پر بطور یادگار اس کا نام مدرسہ عاشقیہ رکھا تھا۔ یہ مدرسہ صرف مولوی سلامت اللہ کی ذات سے قائم تھا اور وہی اس میں درس دیا کرتے تھے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی کتب کی تعلیم ہوتی تھی۔ ایک اور استاذ منشی سعید احمد بھی تھے جو درس کے ساتھ تحصیل چندہ کا کام بھی کرتے تھے

مولوی سلامت اللہ کا زہد و اتقا رام پور میں مشہور تھا۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۲۰ء کو ان کی رحلت ہوئی اور خانقاہ ارشادیہ محلہ کھاری کنواں میں مدفون ہوئے۔[2] ان کی وفات کے بعد مدرسہ بھی ختم ہو گیا۔ (باقی)

---

[1] بقول مولوی محمد یوسف صاحب شمسی فرقانی، مدیر ضیاء وجیہ رامپور [2] دبدبۂ سکندری مورخہ ۲ر فروری ۱۹۲۰ء

آثارِ علمیہ وادبیہ

مولانا عبدالسلام ندوی کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کا خط

۲۲ ۴/۴۳ ء

صدیقی! مسلسل سفر اور مشغولیت نے مہلت نہ دی کہ ڈاک کے تقاضہ سے عہدہ برا ہوتا۔ فروری اور مارچ کے خطوط کا بڑا حصہ ابھی تک باقی ہے۔ فروری کے خطوط میں آپ کا بھی خط تھا۔ تاخیر کے لئے شرمسار اور عذر خواہ ہوں۔ یقین کیجئے آپ سے اور دارالمصنفین کے تمام دوستوں سے ملنے کا بہت جی چاہتا ہے۔ سید سلیمان صاحب سے ملے ایک عرصہ ہوگیا۔ مولوی مسعود علی صاحب شاید پچھلی قرن میں ملے تھے۔ اور خود آپ تو مجدد کے ظہور کی طرح علی راس کل مئة سنة ملا کرتے ہیں۔ یہ آپ نے ٹھیک لکھا ہے کہ ملاقات کے لئے وسطِ ہند میں صلح کانفرنس منعقد کرنے کی ضرورت نہیں لیکن میدانِ جنگ کے کیمپ بھی کیوں قائم رکھے جائیں؟ ادھر کئی مرتبہ میں الہ آباد گیا۔ الہ آباد اعظم گڈھ سے بہت دور نہیں ہے ایک دو دن کے لئے آپ لوگ نکل آتے تو چند گھڑیاں خوشی میں کٹ جائیں۔

آپ نے اپنے خط میں ضمناً ایک ایسی بات لکھ دی جو مستقلاً شرح و بحث کی محتاج تھی، میں نے مولوی مسعود علی صاحب کا تھانہ بھون میں قیام اور بقول آپ کے "مقاماتِ تصوف کا سلوک وعبور" مجھے معلوم نہ تھا کہ ان میں یہ طلب شروع ہوگئی ہے معلوم نہیں باقی یارانِ محفل کا کیا حال ہے۔ میں ۲۰/ اپریل کو الہ آباد جا رہا ہوں۔ غالباً پہلی مئی تک وہاں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مشغولیت رہے۔ کیا اچھا ہو اگر سید صاحب، مسعود علی صاحب اور آپ اس طرح وہاں آجائیں کہ ۲ مئی کو ملاقات ہوسکے۔ اگر کوئی مانع نہ ہو تو ضرور آیئے۔ اگر زندگی میں اب کوئی خوشی کی بات باقی رہ گئی ہے تو صرف یہی ہے کہ کبھی کبھار دوستوں سے دو گھڑی کے لئے یکجائی ہو جائے۔

پنج روزے کہ دریں مرحلہ مہلت داریم ۔۔۔ خوش برآ گئے زمانہ کہ زماں ایں ہمہ نیست

سید صاحب اور مسعود علی صاحب کو سلامِ شوق۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

اخبارِ علمیہ

ترکی میں ایک بار پھر اسلامی علوم وفنون سے دلچسپی روز افزوں ہے، حال ہی میں وہاں کے ایک مؤقر ادارہ آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس کے شعبہ ریسرچ سنٹر فار اسلامک ہسٹری، آرٹ اینڈ کلچر (IRCICA) کا ترجمان "نیوزلیٹر" موصول ہوا ہے، انگریزی کے علاوہ یہ رسالہ فرانسیسی اور عربی میں بھی شائع ہوتا ہے، اس سے ترکی کی علمی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً گزشتہ سال ستمبر میں وہاں اسلامی تہذیب وثقافت پر ایک سمینار ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ علماء ومحققین اسلامی تاریخ وتہذیب اور ادبیات وفنونِ لطیفہ میں جدید علمی طرز پر بحث وتحقیق کریں اور اس راہ میں حائل دشواریوں کا جائزہ لے کر آئندہ دس برسوں کیلئے ایک جامع منصوبہ تیار کریں، سمینار میں، ا ملکوں کے ۳۲ نمائندے شریک تھے۔ انہوں نے تحقیق کے منہج مواد ومعلومات کی ترتیب پیش کرنے کے انداز وغیرہ پر غور کیا، اس کام کے لئے مناسب افراد اور مالی وسائل کے بارے میں بھی غور وخوض ہوا۔ شرکا میں ہندوستان کے ڈاکٹر فرحان احمد نظامی بھی تھے جنہوں نے آکسفورڈ سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے شرکت کی۔

مذکورہ ادارہ کے شعبہ مخطوطات کے صدر اور تاریخ اسلام کے ماہر ڈاکٹر رمضان سیسن نے ایک اور علمی مجلس میں "پندرہویں صدی عیسوی میں ترکی زبان میں تراجم" کے عنوان سے ایک عالمانہ خطبہ دیا، پندرہویں صدی میں ترکی، خلافتِ عثمانی کی سرکاری زبان بنی، اسی صدی میں دوسری زبانوں سے ترکی میں متعدد تراجم کئے گئے، ڈاکٹر رمضان نے تقریباً ۱۰۰ بلند پایہ ترجموں کا ذکر کیا جو اسلامی علوم، ادب، طب، ہندسہ، فلکیات اور جغرافیہ وغیرہ سے متعلق تھے اور عربی، فارسی اور یونانی زبانوں سے منتقل کئے گئے تھے۔

استنبول میں ایک میوزیم ۱۹۱۴ء سے قائم ہے جس میں عہدِ اسلامی کے تقریباً ہر دور کے چالیس ہزار سے بھی زیادہ نفیس ونایاب نوادر موجود ہیں۔ دربارِ عثمانی کے قالین جو ایران اور قفقاز میں تیار کئے گئے عجب

دلفریب ہیں، اناطولی مصور و منقش قالین تو بے نظیر ہیں، ریشمی اور اونی جانمازیں، کمبل، پائنداز اور نمدے تو ایسے ہیں جن کی مثال اور کہیں نہیں ملتی، سلجوقی اور عثمانی دورِ حکومت کے سنگی اور چوبی نوادرات محیر العقول ہیں، بارہ سو سال کے مخطوطات، مجلدات اور خطاطی کے نمونے بھی ہیں، مخطوطات میں عالم اسلام کے بیشتر حصوں کے مصاحف بھی ہیں، جو بنی امیہ، ملوکِ سلاطین، منگول، ترک اور سلجوقی عہد کے ہیں، انکے علاوہ تیموری، صفوی قاجاری، اناطولی اور عثمانی حکومتوں کے زمانہ کے بیش قیمت مصاحف بھی ہیں، دوسرے اسلامی موضوعات کے مخطوطے بھی قابلِ دید ہیں، ترکی اور فارسی زبانوں کے مصور مخطوطے، شاہی فرامین، خلفاء و سلاطین کی مہریں، دستخط شاہی طغرے بیاضیں بھی ہیں جن کی وجہ سے یہ میوزیم اپنی نوعیت کا بے مثال عجائب خانہ ہو گیا ہے، سامرا، رقہ، الپو اور کاشان میں کھدائی کے دوران جو گچی اور چینی ظروف اور دوسرے ساز و سامان ملے وہ سب اسلامی تہذیب و ثقافت کی عظمت کے خاموش شاہد ہیں، یہ میوزیم ۱۹۸۳ء میں قصرِ ابراہیم پاشا میں منتقل ہوا تھا، یہ قصر بجائے خود عثمانی طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔

اس وقت ترکی ہی نہیں، سارے یورپ میں اسلامی علوم و فنون میں فنِ خطاطی سے خاص شغف کا اظہار کیا جا رہا ہے، حال ہی میں جنیوا میں "اسلامی خطاطی، مقدس اور سیکولر تحریریں" کے نام سے ایک نمائش ہوئی، یہ اس سال کے آخر تک یورپ کے دوسرے شہروں ڈبلن، لندن، زیورچ وغیرہ میں بھی ہوتی رہے گی، نمائش کی طرف سے فرانسیسی اور انگریزی میں ایک کیٹلاگ بھی شائع کیا گیا ہے جس میں اسلامی خطاطی کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے، عرب، ایران، افغانستان، ایشیائے کوچک، ترکی اور ہندوستان کے خطاطی اسکولوں کے نمونوں کے ساتھ ان کی خصوصیات کا بھی فنی جائزہ لیا گیا ہے، کیٹلاگ کے آخر میں عالم اسلام کے نقشے، حکومتوں کے احوال اور متن سوانحی حاشیے اور ایک مکمل فرہنگ بھی موجود ہے۔

ایک طرف تو فنونِ لطیفہ کی یہ جھلکیاں ہیں، دوسری جانب ہندوستان میں تاریخ ماقبل تہذیب کی مثالیں آج بھی ملتی ہیں، ٹائمز آف انڈیا کے ایک دلچسپ آرٹیکل سے معلوم ہوا کہ کیرالا میں کوڈنگالور کے مندر میں مارچ اپریل کے مہینوں میں ایک ایسا میلہ لگتا ہے جس میں کیرالا کی مختلف ذاتوں کے ہندو ہزارہا کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں، صرف برہمن نہیں آتے، اس پوجا کی خاص بات یہ ہے کہ اسمیں ہر شخص انتہائی فحش، شرمناک اور بیہودہ گالیاں بکتا ہے، دوہوں اور منتروں کی شکل میں مرد و زن کے تعلق کی تفصیلات اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ شیطان کو بھی شرم آ جائے۔ مندر کی دیوی کو بھی ان فحش منتروں میں شامل کیا جاتا ہے جس کے بارہ میں یہ عقیدہ ہے کہ وہ شادی شدہ دوشیزہ تھی، تمام یاتری عام طور پر شراب کے نشہ میں دھت وحشیانہ رقص کرتے ہیں، مندر کے گرد و پیش کا پورا علاقہ شراب خانوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس تمام عرصہ میں عام آدمی کی زندگی دشوار ہو جاتی ہے، علاقہ کی عورتیں ہی نہیں طلبہ تک خانہ قید ہو جاتے ہیں، اس ننگ شرافت پوجا پر اب بہت سے ہندوؤں نے اعتراض کیا ہے اور اس پر پابندی کا مطالبہ کیا ہے، لیکن پوجا کے حامی یہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا کیا گیا تو دیوی کا غیظ و غضب نازل ہوگا کہ ماضی میں ایک بار ایسا ہو بھی چکا ہے۔

سرزمین ہندوستان کی متضاد صفات کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ فزکس کے نوبل انعام یافتہ اور ایک بہت بڑے سائنسی ادارہ فرمیلاب (FERMILAB) کے ڈائریکٹر جناب لیون میکس لیڈرمین حال میں ہندوستان آئے تو انہوں نے ہندوستانی سائنسدانوں کی صلاحیت کے متعلق کہا کہ "میں نے بھابھا اٹامک ریسرچ سنٹر کو دیکھا، بخدا، وہاں حیرت انگیز کام ہو رہے ہیں، جہاں سائنس اپنے جدید ترین لوازم کے ساتھ موجود ہے۔ میں ہندوستانی سائنسدانوں کی اعلیٰ صلاحیت و کارکردگی سے یقیناً متاثر ہوا ہوں"۔

ع - ص

معارف کی ڈاک

مکتوبِ لاہور

۱۵ جون ۱۹۸۹ء

لاہور۔

فاضلِ محترم جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب

السلام علیکم۔ آپ کا گرامی نامہ گیارہ اپریل کا لکھا ہوا مجھے اکیس مئی کو مل گیا تھا۔ یاد آوری کے لئے شکر گذار ہوں۔

جواباً گزارش ہے کہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی آخری دو جلدیں یعنی بائیسویں اور تیئیسویں پچھلے ہفتے چھپ گئی ہیں اور اب ان کی جلد بندی ہو رہی ہے، اس طرح اصل کام مکمل ہو گیا ہے[1]۔ اس کے بعد تمام جلدوں کا اشاریہ (انڈکس) تکملہ اور تلخیص کا کام باقی رہ گیا ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلامی ہند کی متعدد علمی اور دینی شخصیات اور اسلامی تحریکات پر ارکانِ ادارہ نے خود مضامین لکھنے کے علاوہ ملک کے نامور اہلِ علم سے بھی مقالات لکھوائے ہیں، جن میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) کا اسمِ گرامی سرِ فہرست ہے۔ مزید براں قرآن مجید کی تمام سورتوں پر بھی علیحدہ علیحدہ مقالات شامل ہیں گویا اس میں قرآن پاک کے مطالب کا خلاصہ آگیا ہے۔

آج کل عرب ممالک (قطر سے مراکش تک) سے عربی کی نادر کتابیں اس کثرت سے شائع ہو رہی ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ آپ کی دلچسپی کے پیشِ نظر عرض ہے کہ ان شائع شدہ کتابوں میں صحیح ابن حبان، دلائل النبوۃ (امام بیہقی) شرح السنۃ اور مصابیح السنۃ (امام بغوی) مسند الفردوس (دیلمی) جامع کبیر (السیوطی) اور مسند امام عبد اللہ بن مبارک خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ امام مبارک بن اثیر الجزری کی جامع الاصول اور اس کا مختصر تیسیر الوصول الی جامع الاصول متعدد بار قاہرہ اور بیروت سے خوبصورت ٹائپ میں شائع ہو چکے ہیں۔

غریب الحدیث پر ابن قتیبہ، امام خطابی، ابن الجوزی اور ابراہیم الحربی کی کتابیں آپ کی نظر سے گزری ہوں گی۔ اوّل الذکر کتاب عراق کے محکمۂ اوقاف نے بغداد سے اور آخر الذکرتین کتابیں جامعہ ام القریٰ (مکہ معظمہ) نے تصحیح و تحقیق کے تمام ضروری لوازم کے ساتھ شائع کی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے بیس بائیس برس قبل امام ابو عبید قاسم بن سلام کی غریب الحدیث حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوئی تھی جو تحقیقی اعتبار سے ناقص اور غیر معیاری تھی۔ اب اس کا نیا ایڈیشن استاد عبد السلام محمد ہارون کی نظر ثانی اور نگرانی میں وزارتِ اوقاف مصر کی طرف سے شائع ہوا ہے جو مفید حواشی پر مشتمل ہے۔

استاد ناصر الدین البانی شام کے مشہور محقق عالم اور فاضل محدث ہیں، جنہوں نے حدیث کی متعدد کتابیں تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کی ہیں۔ وہ ایک خاص مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے احناف کے علمی حلقوں کو ان کی تنگدلی اور تنگ نظری کی ہمیشہ شکایت رہی ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ البانی صاحب کے بعض اغلاط اور مزعومات کی تردید میں شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب نے ایک کتاب "البانی: شذوذہ و اخطاؤہ" کے نام سے لکھ کر کویت سے شائع کرائی ہے۔

تین ماہ ہوئے میں نے مشہور مصری ناول نگار نجیب محفوظ پر ایک مختصر سا مضمون برائے اشاعت ارسالِ خدمت کیا تھا، جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکا[2]۔ یہ مضمون ڈاکٹر مختار الدین آرزو صاحب (علی گڈھ) کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔

اس طول نویسی کے لئے معذرت خواہ ہوں، اگرچہ آپ کی دلچسپی کی بہت سی چیزیں اس میں شامل ہو گئی ہیں۔ رفقائے کرام کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔　　طالبِ دعا:

(شیخ) نذیر حسین، مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

---

[1] تمام جلدوں کی قیمت چھ ہزار روپے کے قریب ہے اور یہ جلدیں پنجاب یونیورسٹی کے سیلز ڈپو سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

[2] جون کے معارف میں چھپ گیا ہے۔

مطبوعات جدیدہ

حواشی ابوالکلام آزاد مرتبہ جناب سید مسیح الحسن صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۵۰۰، مجلد مع مصور کور، قیمت ۱۶۲ روپیے، پتہ اردو اکادمی، دہلی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم بچپن ہی سے علم و مطالعہ کے شوقین تھے، وہ جن کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے ان پر حواشی بھی تحریر فرماتے تھے، انھوں نے جب اپنی وزارت تعلیم کے زمانہ میں انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی داغ بیل ڈالی تو اس کے کتبخانہ کو اپنی تمام ذاتی کتابیں دیدیں، جناب سید مسیح الحسن صاحب اس لائبریری کی تنظیم و ترتیب کے کام پر عرصہ تک مامور رہے، اس سلسلہ میں ان کی نظر مولانا کے تحریر کردہ حواشی پر بھی پڑی تو انہیں ان کو عام کے لیے شایع کرنے کا خیال ہوا، اس سلسلہ کا آغاز پہلے سہ ماہی "اسلام و عصر جدید" کے بعض شماروں میں کیا گیا تھا درمیان میں موقوف ہوگیا، اب مولانا آزاد کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر انہیں کتابی صورت میں شایع کیا گیا اس میں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کی ۸ہ کتابوں پر حواشی درج ہیں، ان میں اردو کتابوں کی تعداد زیادہ اور اردو کتابوں میں ایک تہائی مولانا شبلی کی ہیں، ان کے علاوہ دار المصنفین کی حسب ذیل تین کتابوں پر بھی مولانا کے حواشی درج ہیں (۱) حیات شبلی (مولانا سید سلیمان ندوی) (۲) ابن رشد (مولوی محمد یونس فرنگی محلی مرحوم) (۳) رقعات عالمگیر (سید نجیب اشرف ندوی مرحوم) جن کتابوں پر مولانا نے اختلافی حواشی قلمبند کیے ہیں، ان سے مکمل اتفاق ضروری نہیں ہے، مولانا آزاد مولانا شبلی کے خاص فیض یافتہ تھے اس لیے ان سے بڑی عقیدت و اخلاص رکھتے تھے اور ان کا بڑا احترام بھی کرتے تھے، خود مولانا شبلی بھی انکی غیر معمولی ذہانت و قابلیت کی بنا پر انہیں بہت عزیز رکھتے تھے لیکن یہ روابط علمی و تحقیقی امور میں اختلاف سے مانع نہیں ہوئے البتہ کہیں کہیں لب و لہجہ اس لیے تیز ہوگیا ہے کہ مولانا کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ یہ حاشیے کبھی شایع ہونگے، سیرۃ النعمان پر مولانا کا نقد اس لیے بھی ہے کہ وہ خود حنفی تھے اور مولانا شبلی ابتدا میں غالی حنفی تھے جس کا اثر بعد میں زائل ہوگیا تھا سیرۃ النعمان

ان کے ابتدائی دور کی تصنیف ہے، فن شاعری میں مولانا آزاد کو شوق نیموی سے تلمذ رہا مگر ان کو بھی حنفیت میں غلو تھا اس لیے مولانا نے ان کی کتابوں پر بھی جابجا گرفت کی ہے، اسی طرح مولانا کا میلان عام اشکوہ کی جانب زیادہ تھا جو خود ایک موضوع بحث ہے اس لیے مضامین عالمگیر کے بعض حصوں سے بھی ان کو اختلاف رہا، تعجب ہے کہ مولانا شبلی کے عقد ثانی کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی کے بیان کے سلسلہ میں انھوں نے کس طرح ایک بے سروپا اور غیر مصدق واقعہ لکھدیا، مندرجہ ذیل کتب پر بھی مولانا کے حواشی طویل ہیں (۱) ترجمہ قرآن ڈپٹی نذیر احمد (۲) کتاب مقدس نیا اور پرانا عہد نامہ (۳) کلیات میر (۴) خزانہ عامرہ (علامہ آزاد بلگرامی) (۵) توزک جہانگیری (۶) مآثر الامراء سہ جلد (۷) AKBARANDTHEJESUITS (PIERRE DU JARRIC) (۸) THEINDIANMUS ALMANS (W.W.HUNTER) مولانا کے حواشی اہم اور قدر و قیمت کے حامل ہیں اور فاضل مرتب نے ان کو سلیقہ سے ترتیب دیا ہے، انھوں نے پہلے تو کتابوں کو فن وار تقسیم کیا ہے اور ہر فن کے تحت مختلف زبانوں کی کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام حروف تہجی کے ترتیب کے مطابق دیئے ہیں پھر تین کالموں میں بالترتیب متن کے صفحہ کا حوالہ اس کا سیاق و سباق اور آخر میں مولانا کے حواشی درج کیے ہیں۔ شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے، جس میں حواشی کی نوعیت و خصوصیت اور ان کے تعلق سے دوسری ضروری مفید باتیں بیان کی ہیں نیز مولانا کی عظمت و کمال کے مختلف پہلو دکھائے ہیں۔

مگر کتابت و طباعت کے اغلاط بکثرت ہیں، گو عربی عبارتوں کے غلط نقل ہو جانے کی مرتب نے معذرت کی ہے مگر اس کے باوجود انہیں بری الذمہ نہیں قرار دیا جا سکتا خصوصاً کلام مجید کی آیتوں کا تو اس سے مقابلہ کر لینا بہت آسان تھا، مگر پتہ نہیں کیوں انہیں بھی محض کاتب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

"ض"

عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک ۱۷۱۰ء تا ۱۹۶۰ء ARABIC AND PERSIAN IN CARNATIC مولانا محمد یوسف کوکن، تقطیع کلاں، کاغذ، طباعت معیاری، صفحات ۵۹۵ مجلد مع گرد پوش قیمت ۸۰ روپیہ، پتہ: حفیظ ہاؤس ۶، میلاپورن اسٹریٹ، مدراس۔

مولانا محمد یوسف کوکن کی شخصیت تعارف سے مستغنی ہے، ان کو اردو کے علاوہ عربی فارسی انگریزی تامل، اور ہندی زبانوں پر بھی اچھی قدرت حاصل ہے، انھوں نے ۱۹۶۴-۶۵ء میں کرناٹک میں عربی اور فارسی کے عنوان سے ایم لٹ کے لیے انگریزی میں ایک مقالہ لکھا تھا، اب یہ کتابی صورت میں طبع ہوا ہے، جنوبی ہند میں ہندوستان کے مشرقی اور مغربی ساحلوں کے درمیان بال گھاٹ سے بیدر اور گنتور سے کیپ کومورن، بلکہ ماضی کے مالابار تک کا علاقہ کرناٹک میں شامل تھا جو اپنی دولت، زرخیزی اور بحری تجارت کے علاوہ علمی حیثیت سے بھی اہم خیال کیا جاتا تھا یہاں عربی و فارسی اور اردو کے بڑے بڑے شاعر، نثر نگار اور صاحب تصنیف و تالیف پیدا ہوئے، مگر علمی و تمدنی مرکزوں سے دوری کی بنا پر ان کو وہ شہرت حاصل نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے، مولانا محمد یوسف کوکن نے ان ارباب کمال کے نام نیک کو ضائع ہونے سے بچا لیا، جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، اس کتاب میں پہلے ۱۷۱۰ء سے ۱۷۴۲ء تک نوائط حکومت کے عہد کے علماء و شعراء کا ذکر ہے پھر انوار الدین خاں کے دور ۱۸۰۱ء تک اور نواب عظیم الدولہ کے زمانہ حکومت ۱۸۴۱ء کے علماء و فضلا اور شعراء و ادباء کے حالات درج ہیں، ۱۸۴۱ء سے ۱۸۵۵ء تک نواب غلام غوث خاں بہادر کے عہد میں جو مشاہیر گذرے ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے پانچویں باب میں انگریزوں اور آزاد ہندوستان کے ۱۹۶۰ء تک کے ناموروں کا ذکر ہے شروع میں فاضل مصنف کے قلم سے گیارہ صفحے کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی ہے، اس کتاب میں تقریباً

۹۰ اصحاب علم و کمال کے حالات کے علاوہ اس علاقہ کے اہم علمی و تعلیمی اداروں کا تعارف بھی کرایا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب کرناٹک کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ایک دلکش مرقع ہے مصنف نے شعرا کے عربی فارسی اور اردو کلام کے نمونے بھی دیے ہیں اردو کلام دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ دہلی، لکھنؤ بلکہ حیدرآباد سے دور ہونے کے باوجود اس درجہ بلند پایہ اشعار وہاں کیسے ڈھلے۔

سرنخفی سے انا الحق کے نہ تھا میں واقف
جب تلک تیغ مرا حضرت منصور نہ تھا

میدان عشق سے کبھو سر کے نہ عشق یار
سرجائے تو بلا سے دلیری بھلی بھلی

گر چاندنی میں آئے نہ مہتاب رو میرا
اس روشنی سے مجھ کو اندھیری بھلی بھلی

یہ کتاب دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے، بہتر ہوتا کہ انگریزی شعرا کے کلام کا ترجمہ یا خلاصہ بھی انگریزی میں دیدیا جاتا، مگر مصنف نے خود اقرار کیا ہے کہ کتاب کا حجم بڑھ جانے کے اندیشہ سے ایسا نہیں کیا گیا۔

اسلام، جنرل پکچر ISLAM, GENERAL PICTURE ڈاکٹر محمد حمید اللہ، تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت، اعلیٰ، صفحات ۱۲۸، غیر مجلد قیمت ۱۵ روپیے، پتہ: حضرت صفی الدین ٹریری اینڈ ریلیجیس ٹرسٹ ۲/۴ ۷-۹-۱۶، اولڈ ملک پیٹ، حیدرآباد، اے پی۔

مشہور فاضل ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی یہ کتاب پہلے امریکہ سے شائع ہوئی تھی، ان کا مقصد غیر مسلموں خصوصاً عیسائیوں کے لیے ایسی مختصر اور جامع کتاب لکھنا تھا جو اسلام کے عام تعارف میں ممد و معاون ہو، گو اس قسم کی کتابیں اور بھی لکھی گئی ہیں مگر بقول ڈاکٹر صاحب جو جتنی زیادہ جامع ہوگی اتنی ہی مفید ہوگی، یہ کتاب مصنف کی وسعت نظر، علمی بلند پایگی اور شستہ طرز بیان کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی، اب اسے ہندوستان کے انگریزی داں حلقہ کے لیے حیدرآباد سے شائع کیا گیا ہے، ہندوستانی قارئین کی رعایت سے اس ایڈیشن میں WHY A

NEW RELIGION کے عنوان سے ایک نئے باب کا اضافہ بھی کیا گیا ہے اس میں مجوس، ہندو اور بودھ مذہب کے متعلق دلچسپ معلومات بیان کیے گئے اور کہیں کہیں بعض نکتے بھی آ گئے ہیں جو قابل توجہ ہیں مثلاً عجل سامری اور لاماسس کا تعلق گائے پوجا اور اچھوتوں سے ظاہر کیا گیا ہے، زبر الاولین سے جہاں قدیم صحف مراد ہیں وہاں پر ان اور ویدوں کا بھی امکان ہو سکتا ہے، حضرت ابراہیمؑ اور رام چندر جی میں 'حیرت انگیز' مماثلت کا بھی ذکر ہے، بائبل میں WARS OF LORD کی جھلک مہابھارت اور گیتا کے واقعات میں ظاہر کی گئی ہے، اس قسم کی باتیں پہلے بھی بعض علماء نے تحریر کی ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کے قلم نے ان کو مزید جدت و تازگی عطا کی ہے، کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے، تین ابواب میں اسلام و ایمان کے بنیادی عقائد کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں روزمرہ کی زندگی میں بعض اسلامی اصولوں کی اہمیت کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کے تین ہی اہم فرقے بتائے ہیں جن میں سنی اور شیعہ کے علاوہ خارجیوں کے معدوم فرقے کا ذکر بھی ہے (ص ۳۴) گرونانک کا یہ واقعہ نسخۂ ثبوت ہے کہ وہ بیت اللہ الحرام میں خانہ کعبہ کی جانب پیر پھیلا کر لیٹے تھے کسی نے اس بے ادبی پر ان کو ٹوکا تو جواب دیا کہ میرے پیروں کو کسی ایسی سمت کر دو جہاں خدا نہ ہو (ص ۱۵۰) غالباً اس قسم کی روایتیں رواداری اور حکمت دعوت کے پیش نظر نقل کر دی گئی ہیں اور ان میں تنقید و تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔

کیٹلاگ آف مینوسکرپٹس ان دی مولانا آزاد لائبریری CATELOGUE OF MANUSCRIPT

ایم، ایچ رضوی و ایم ایچ قیصر امروہوی، تقطیع کلاں کاغذ طباعت، عمدہ، صفحات جلد اول ۳۲۸ جلد دوم ۳۸۶، قیمت درج نہیں، پتہ: مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں مخطوطات کی تعداد ۴۰ ہزار سے بھی زائد ہے، جن میں حبیب گنج کلکشن کے نادر و نایاب مخطوطات کی بڑی اہمیت ہے، یہ حصہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم و مغفور کے عمدہ علمی ذوق اور علم و ادب نوازی کا بہترین نمونہ ہے، کئی برس پہلے ان کی روایات و خصوصیات کے حامل اور علم دوست صاحبزادے نواب الحاج مولوی عبید الرحمن خاں شروانی نے اپنے والد بزرگوار کے اس بیش قیمت ذخیرہ کو عام فائدے کے لیے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو مرحمت کر دیا تھا، مخطوطات کے خزینے عموماً لوگوں کی نظر سے مخفی اور دسترس سے باہر ہوتے ہیں اور مخطوطات شناسی اور ان کا تعارف بھی مشکل کام ہے مگر خوشی ہے کہ لائبریری کے ذمہ داروں نے اس مشکل کو بہت اچھی طرح انجام دیا ہے، زیر نظر کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے اور ان دونوں میں حبیب گنج کلکشن کے فارسی مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے، پہلی جلد میں صرف شعری مخطوطات کا ذکر ہے، اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی معنوی، دیوان ابن یمین، دیوان حافظ، دیوان کمال خجندی، دیوان امیر شاہی اور دیوان صائب وغیرہ کے کیسے نادر و نایاب نسخے سلاطین و امراء کی مہروں سے مزین اس خزانہ میں موجود ہیں، کل ۴۰۵ مخطوطات کا مکمل تعارف ہے، آخر میں نہایت سلیقہ اور محنت سے الگ الگ اشاریے بھی دیے گئے ہیں جس سے اہل علم و تحقیق کے لیے بڑی سہولت ہو گئی ہے دوسری جلد میں فارسی کے ان مخطوطات کا ذکر ہے جن کا تعلق علوم اسلامیہ، تاریخ اور سوانح وغیرہ سے ہے، ان کی تعداد ۱۴۹۱ ہے، یہ دوسری جلد اور بھی زیادہ سلیقہ سے جدید ترین طریقہ پر مرتب کی گئی ہے، کتاب کے شروع میں اہم مخطوطات کا ذکر الگ سے کیا گیا ہے جن میں تبیینہ الغفول، مجموعۂ عالمگیری، شرف المذاہب، مکتوبات شاہ پیر محمد، ملفوظات شاہ وجیہ الدین، انیس العاشقین، سلسلۃ العارفین، چہار باب، الشائے مرواید مطالع الہند، انیس المحققین اور سلسلۃ الذہب جیسے مخطوطات شامل ہیں۔

1. THE PROOF OF PROPHETHOOD ۱۔ دی پروف آف پروفٹ ہڈ

صفحات ۱۲۰۔ ۲۔ دی سنی پاتھ 2. THE SUNNI PATH صفحات ۳۸۶۔

3. ANSWER TO AN ENEMY OF ISLAM آنسر ٹو این اینمی آف اسلام

صفحات ۱۲۸، کاغذ طباعت بہتر، قیمت ترکی سکہ میں، پتہ: وقف اخلاص

پبلیکیشنز۔ حقیقت کتابوی، استنبول ترکی۔

یہ تینوں رسالے ترکی کے ادارہ وقف اخلاص نے شایع کیے ہیں، جن کے حسن قبول کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے پیش نظر ان کے ساتویں اور آٹھویں ایڈیشن ہیں۔ اول الذکر میں پہلا اور اہم مضمون شیخ مجدد الف ثانیؒ کے رسالہ اثبات النبوۃ کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اوقات الصلوٰۃ پر بھی ایک مفید مضمون شامل ہے، اس میں جدید ریاضی، الجبرا اور جیومیٹری کے رو سے نماز کے اوقات کو نہایت موزوں اور مناسب بتایا گیا ہے، دوسرے رسالہ دی سنی پاتھ کا پہلا مضمون ترکی کے ایک ممتاز عالم احمد جاوید پاشا ۱۸۲۳/۱۸۹۴ کے مضمون معلومات نافعہ کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس میں اہل سنت کے مسلک کی حمایت اور شیخ عبدالوہاب کے خیالات کی تردید کی گئی ہے، دوسرے مضامین بھی اسی نوعیت کے ہیں جن کا رنگ مناظرانہ ہے۔ تیسرا کتابچہ علامہ رشید رضا مصری کی کتاب محاورات المصلح والمقلد کے رد میں ہے اس کا لہجہ تیز و تند اور نامناسب ہے۔

پلین اسپیکنگ ٹو مسلمس (PLAIN SPEAKING TO MUSLIMS)

از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مترجم: قاضی عبدالحمید، کاغذ طباعت بہتر صفحات ۳۰۷، قیمت مذکور نہیں۔

پتہ: بورڈ آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڈھ، بھوپال، اندور۔

یہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک اردو مضمون تھا جو "مسلمانانِ ہند سے کچھ صاف صاف باتیں" کے عنوان سے پہلے ہفت روزہ ندا کے ملت میں چھپا تھا اور مفید ہونے کی بنا پر ملک کے اکثر رسائل و اخبارات میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوا تھا، اب یہ انگریزی ترجمہ اس رسالہ کی صورت میں شائع ہوا، تاکہ غیر اردو داں حلقہ بھی اس سے مستفید ہو سکے۔ "ع۔ ص"

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱. سیرۃ النبی جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ قیمت ۵۸/=
۲. سیرۃ النبی جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ ۵۸/=
۳. سیرۃ النبی جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔ ۲۸/=
۴. سیرۃ النبی جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ ۵۸/=
۵. سیرۃ النبی جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ ۲۳/=
۶. رحمت عالمؐ۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ ۷/=
۷. خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ ۱۶/=
۸. سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔ ۲۵/=
۹. حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ ۵۸/=
۱۰. ارض القرآن ج۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔ ۲۴/=
۱۱. ارض القرآن ج۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ ۱۸/=
۱۲. خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ ۴۵/=
۱۳. عربوں کی جہاز رانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ ۱۵/=
۱۴. عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) ۴۹/=
۱۵. نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی) ۴۲/=
۱۶. یاد رفتگاں۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات ۳۳/=
۱۷. مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ ۳۳/=
۱۸. مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ ۲۹/=
۱۹. مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) ۲۹/=
۲۰. برید فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔ ۲۰/=
۲۱. دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے ۴/= ۶/=

"مندھو"